ناولٹ

دل کی دہلیز پہ شبنم کی خنکی

فرحت اشتیاق

اپنے گھر کی بیک پر بنے اس گھر کو وہ اس کی تعمیر کے ابتدائی مرحلے سے ہی بغور دیکھ رہی تھی۔ بنیادوں سے لے کر تزئین و آرائش کے اختتامی مرحلوں تک اسے اس گھر کے طرز تعمیر نے نہایت متاثر کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں کے مکین نہایت ہی باذوق تھے۔ ہزار گز پر بنا وہ ایک بڑا ہی کھلا ہوا دار اور دلکش بنگلہ تھا۔ رمیشہ کا تو پورا بچپن اسی گھر میں گزرا تھا اور یہ اس کا مخصوص کمرہ بچپن سے اس کے زیر استعمال رہا تھا۔ اسے شروع سے ہی شور شرابے سے الجھن ہوتی تھی۔

اسی لیے اس کا بیڈ روم سب سے الگ تھلگ تھا۔ اپنے کمرے ہی میں کھلنے والی بالکونی میں بیٹھ کر اگلے روز کے لیکچرز کی تیاری کرنا اس کا من پسند کام تھا۔

تقریباً سال بھر پہلے شیخ صاحب کی فیملی یہ مکان فروخت کر کے کینیڈا سیٹل ہو گئی تھی۔ اسے بس اتنا ہی پتا تھا کہ شیخ صاحب نے یہ مکان کسی امریکہ سے پاکستان منتقل ہونے والی فیملی کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ اس سے زیادہ نہ اسے معلوم تھا اور نہ ہی اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے حال میں مگن رہنے والے لوگوں میں سے تھی۔ اسے بس اتنا فرق پڑا تھا کہ پہلے جب وہ شام میں بالکونی میں بیٹھی لیکچرز تیار کر رہی ہوتی تو کبھی مونا اور کبھی آنٹی سے آمنا سامنا ہو جاتا تھا اور پھر ان لوگوں کے ساتھ تھوڑی بہت گپ شپ بھی ہو جاتی تھی۔ ان لوگوں کے جانے سے وہ جگہ ایک دم ویران لگنے لگی تھی۔ نئے خریدار نے پورا مکان گرا کر نئے سرے سے بنوایا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ گھر کی ڈیزائننگ اور پلاننگ کسی بہت ہی ماہر آرکیٹیکٹ سے کروائی گئی تھی۔ وہ اکثر کام کرتے کرتے بے خیالی میں بیٹھی کافی دیر تک اس گھر کو تکتی رہتی تھی۔ جب گھر کی بیک سائیڈ اتنی شاندار تھی تو فرنٹ تو پتا نہیں کتنا عالیشان ہو گا۔ رمیشہ اکثر سوچا کرتی تھی۔ پچھلی گلی میں کیونکہ شیخ صاحب کے علاوہ اور کسی فیملی کے ساتھ اتنے گہرے مراسم نہیں تھے اسی لیے وہاں اتنا آنا جانا بھی نہیں ہوتا تھا۔

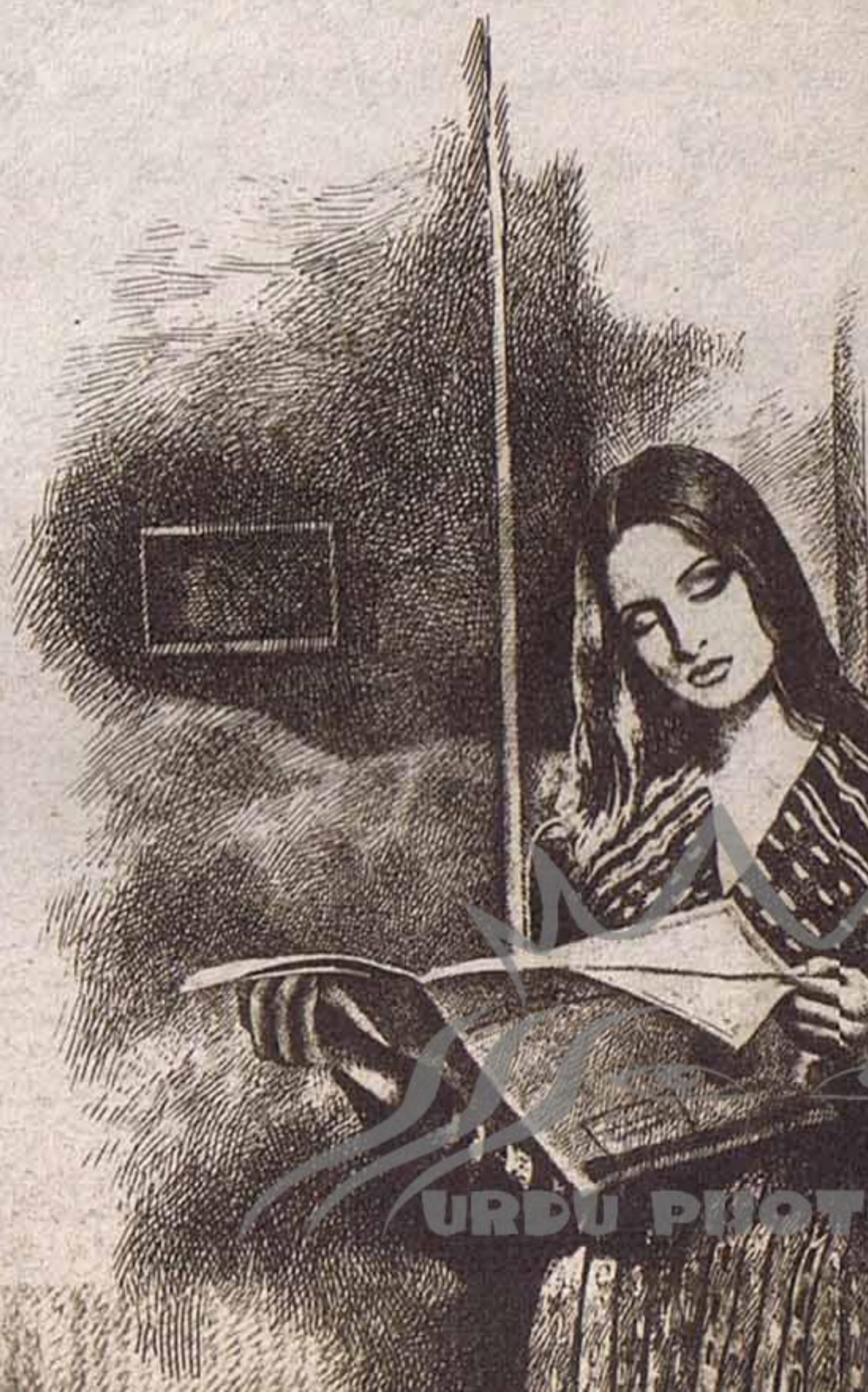

آٹھ نو ماہ کے عرصے میں وہ گھر مکمل ہو گیا تھا۔ نئے مالک کو شاید پودوں سے بہت لگاؤ تھا اسی لیے وہاں ایک سے ایک عمدہ اور خوبصورت پودے نظر آتے تھے۔ کیاریوں میں لگے وہ چھوٹے چھوٹے پودے جنہیں کل تناور درخت بن جانا تھا۔ وہ بلاوجہ ہی وہاں کی ایک ایک چیز کو دلچسپی سے دیکھتی اور وہاں مستقبل قریب میں بسنے والے لوگوں کے ذوق کو سراہتی۔ پھر ایک روز جب وہ اریب اور عاشی کے ساتھ رات میں واک کے لیے نکلی تو خاص طور پر اپنی پچھلی گلی میں بھی گئی اور اس گھر کو سامنے سے دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے واہ نکل گیا۔ ابھی تک وہ گھر خالی ہی تھا۔ رمیشہ کے خیال سے تو گھر ہر لحاظ سے مکمل ہو گیا تھا پتا نہیں کیا وجہ تھی کہ وہاں ابھی تک کوئی بسا نہیں تھا۔ اتنے خوبصورت گھر میں یہ ویرانی اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"خالہ! پیچھے والے گھر میں نئے لوگ شفٹ ہو گئے ہیں۔" ناشتے کی میز پر وہ اریب، عاشی اور بھیا بیٹھے تھے جبکہ بھابھی کچن میں مصروف تھیں۔ اریب کی بات پر اس نے چونک کر اخبار پر سے سر اٹھایا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"میں کل خرم کے گھر گیا تھا تو وہاں پورٹیکو میں بلیک سوک کھڑی دیکھی تھی اور اندر لائٹس بھی آن نظر آ رہی تھیں۔" اریب نے جواباً کہا تھا۔

صبح کا وقت اتنی افراتفری اور بھاگ دوڑ والا ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ تفصیلات وہ معلوم نہیں کر سکتی تھی۔ روزانہ اس کی صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہو جاتی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ جلدی جلدی امی کے لیے ناشتا تیار کرتی۔ انہیں نماز کے فوراً بعد چائے چاہیے ہوتی تھی۔ اگر کسی روز اسے چائے لے جانے میں دیر ہو جاتی تو وہ ناراض ہو کر ناشتہ بھی نہیں کرتی تھیں۔ مسلسل بیماری نے انہیں بہت ضدی بنا دیا تھا۔ اسے بچوں کی طرح انہیں بہلانا پڑتا تھا۔ ہارٹ پیشنٹ تو وہ برسوں سے تھیں، مگر پانچ سال پہلے جب وہ گھر کی سیڑھیاں اترتے گر پڑی تھیں۔ اس کے بعد سے ان کی بیک بون اتنی بری طرح متاثر ہوئی کہ تمام تر علاج معالجے اور احتیاط کے باوجود وہ اپنی جگہ برقرار تھی۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ بالکل معذور ہی ہو گئی تھیں۔ وہ چل پھر لیتی تھیں، مگر جھک کر ان سے کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا اسی لیے رمیشہ کو ان پانچ سالوں میں ان کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنا پڑا تھا۔

امی کو ناشتہ کرا کے اور ان کے دیگر تمام کام یعنی دوا بنانا کپڑے بدلوانا وغیرہ انجام دے کر وہ جلدی جلدی اپنی تیاری کرتی تھی۔ ناشتے کی تیاری میں بھابھی کا ہاتھ بٹانا لازمی تھا ورنہ ان کا منہ پھول جاتا تھا اور اپنی زندگی کے اتنے برسوں میں وہ ابھی تک اس بات کی عادی نہ ہو سکی تھی کہ کسی کا بنا ہوا منہ دیکھ سکے۔ کوئی اس سے ناراض ہو جائے۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ چاہے سامنے والے کو خوش کرنے کے لیے اسے اپنا کوئی نقصان ہی کیوں نہ کرنا پڑے، وہ ایسا کرتی ضرور تھی۔

پہلے کالج جانے کے لیے اس نے وین لگوائی ہوئی تھی۔ اس وقت تو اور بھی زیادہ ٹینشن ہوتی تھی، اگر وین نکل گئی تو پھر رکشہ یا بس سے جانا پڑے گا۔ یہ سوچ اسے پریشان کرتی رہتی تھی۔ جب سے اس نے اپنی ذاتی گاڑی خریدی تھی۔ اس ٹینشن سے جان چھوٹ گئی تھی۔ گاڑی خریدنے سے جہاں اسے آنے جانے کی سہولت ہوئی تھی، وہیں کچھ پریشانیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ وقت بے وقت بھابھی کو شاپنگ یا کسی بھی کام سے باہر جانا ہوتا تو اسے ڈرائیوری کے فرائض انجام دینے پڑتے۔ بھیا اپنی گاڑی آفس لے جاتے تھے۔ انہیں یوں بھی بھابھی کی شاپنگ وغیرہ سے سخت الجھن ہوتی تھی۔ عاشی یا سمعیہ کو اپنی فرینڈز کے گھر جانا ہوتا تو اس کی منتیں شروع ہو جاتیں اور اسے موڈ نہ ہونے کے باوجود ان کی بات ماننی پڑتی۔ اریب اور عاشی تو اسکول بھی اسی کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ وہ دونوں ہی اس سے بہت مانوس تھے۔

ابیا اور جواد بھائی ریاض میں رہتے تھے۔ جواد بھائی

وہاں ایک امریکن فرم میں بڑی اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ شروع شروع میں تو دونوں بچے وہاں ابیا کے پاس ہی رہے۔ مگر جیسے جیسے بچے بڑے ہونے لگے۔ ابیا اور جواد بھائی دونوں ہی کو بچوں کی تعلیم وغیرہ کی طرف سے پریشانی ہونے لگی۔ جواد بھائی کو خاص طور پر سعودی عرب کا معیار تعلیم اپنے بچوں کے لیے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اسی لیے آخر کار یہی فیصلہ کیا گیا کہ دونوں کو کراچی بھیج دیا جائے۔ جواد بھائی کے والدین تو تھے نہیں۔ بہن بھائی بھی سب پاکستان سے باہر مقیم تھے اس لیے طے یہی کیا گیا کہ بچوں کو ان کے ننھیال میں چھوڑ دیا جائے۔

شروع شروع میں دونوں ہی نے اپنے ماں باپ کو بہت مس کیا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ وہ دونوں یہاں سیٹ ہوتے چلے گئے۔ انہیں یہاں مانوس کرنے میں رمیشہ کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ جب وہ لوگ یہاں آئے تھے۔ رمیشہ تازہ تازہ یونیورسٹی سے فارغ ہوئی تھی۔ اسے رزلٹ کا انتظار تھا اس کے بعد اس کا لیکچرر شپ کا ارادہ تھا۔ فراغت کے ان دنوں میں اس نے بچوں کو بھرپور وقت دیا تھا۔ تب ہی آٹھ سالہ عاشی اور چھ سالہ اریب کی اپنی اکلوتی خالہ سے اتنی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی کہ پھر انہیں چھٹیوں میں بھی سعودی عرب جانے میں مزہ نہیں آتا تھا۔ ان سات برسوں میں اس نے ان دونوں کا بہت خیال رکھا تھا۔

عاشی کا یہ اسکول کا آخری سال تھا جبکہ اریب ایٹھ اسٹینڈرڈ میں تھا۔ صرف عاشی اور اریب ہی نہیں بلکہ سمعیہ، سنی اور عبداللہ کی بھی وہ پسندیدہ تھی۔ انہیں بھی اپنی یہ چار منگ اور ہنس مکھ پھپھو دل وجان سے عزیز تھی۔ سمعیہ سب بچوں میں بڑی تھی۔ اسی حساب سے سب پر بڑی بہنوں والا رعب جمانے کی کوشش کرتی تھی، جس سے سب ہی چڑا کرتے تھے۔ وہ ہوم اکنامکس کالج میں فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ جبکہ سنی اور عبداللہ اریب ہی کے کلاس فیلو تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

اریب کی دی ہوئی اطلاع کی تصدیق یوں ہو گئی کہ اسی روز رات میں اس نے اپنے کمرے کے سامنے والے کمرے کی لائٹ جلی دیکھی تھی۔ بند پردوں کے پیچھے اسے کوئی بندہ بشر تو کیا نظر آتا بس روشنی دیکھ کر یہ اطمینان ہو گیا کہ وہاں نئے لوگ شفٹ ہو گئے ہیں۔ ورنہ وہاں کی خاموشی اور ویرانی دیکھ کر کبھی کبھی اسے ڈر لگنے لگتا تھا۔ امی، بھیا بھابھی، عاشی اور سمعیہ کے بیڈ روم نیچے تھے۔ جبکہ عبداللہ، سنی، اریب اور اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا۔ کبھی سوتے سے آنکھ کھل جاتی اور اچانک ہی نظر سامنے پڑتی تو وہاں گھپ اندھیرا دیکھ کر اسے ایک دم ہی کوئی نہ کوئی ہارر مووی یاد آ جاتی۔ بچوں کے کمرے میں یوں نہیں جا سکتی تھی کہ ان سب کا خیال تھا کہ ان کی خالہ اور پھپھو بڑی ہی بہادر خاتون ہیں، اب وہ بچوں کو کیا بتاتی کہ اسے سامنے والے گھر کی ویرانی دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔

نئے لوگوں کے آ جانے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ دس پندرہ دن ہو گئے تھے اس کی ابھی تک نئے مکینوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ صبح کے وقت تو وہ خود بھی گھر پر نہیں ہوتی تھی۔ ڈھائی تین بجے اس کی کالج سے واپسی ہوتی تھی۔ اس وقت سے لے کر اور رات تک اسے وہاں سوائے خاموشی اور اندھیرے کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ رات آٹھ نو بجے کے قریب سامنے والے کمرے کی لائٹ آن ہوتی تھی۔ باقی کمرے اس کے بعد بھی اندھیرے میں ڈوبے رہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں ایک یا دو ہی افراد رہتے ہیں۔ بھابھی نے تو باقاعدہ حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"پتا نہیں لوگوں کے پاس اتنا فالتو پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ رہنے والے نہیں ہیں اور اتنا عالیشان مکان تیار کر لیا۔ یہاں یہ حال ہے کہ تین سال ہو گئے ہیں گھر میں وائٹ واش نہیں ہوا۔ فرنیچر بھی پانچ چھ سال سے وہی چل رہا ہے۔"

بھابھی کے ایسے شکوؤں پر بھیا دھیان نہیں دیتے تھے اسی لیے وہ ہنوز ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھے رہے تو وہ منہ بنا کر کھڑی ہو گئیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"اس روز اتوار کا دن تھا۔ اپنے ہفتے بھر کے جمع شدہ کام نبٹا کر اب وہ اپنی من پسند جگہ پر بیٹھی کل کے لیکچرز تیار کر رہی تھی۔ سب ہی کو پتا تھا اس وقت وہ اپنا لکھنے پڑھنے کا کام کرتی ہے' اس لیے اس وقت اسے کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا تھا۔ سائیڈ میں رکھا چائے کا کپ اٹھانے کے لیے اس نے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا۔ اس کی فائل کے اوپر رکھے ہوئے تین چار صفحے ایک دم ہوا کے زور سے اڑ گئے۔ اس سے پہلے کے وہ انہیں پکڑتی انہوں نے اپنی پرواز کا سلسلہ جاری رکھا اور سامنے والے گھر کی بالکونی میں جا کر ہی لینڈ کیا۔ سامنے ہی پڑے سکون سے آرام فرما ان صفحات کو وہ صرف دیکھ سکتی تھی۔ اچھا خاصا کام کا ٹیمپو بگڑ کر رہ گیا تھا۔ خود پر بھی غصہ آرہا تھا کہ اتنی تیز ہوا چل رہی تھی تو احتیاط کرنی چاہیے تھی۔

ابھی وہ کف افسوس مل ہی رہی تھی کہ سامنے والے کمرے کی سلائیڈنگ کھول کر ایک بندہ باہر بالکونی میں نکلا۔ تولیے سے بال خشک کرتا وہ اپنی دھن میں مگن شاید کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔ رمیشہ نے اس بندے کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

"ایکسکیوزمی!" وہ کرسی پر سے اٹھ کر ریلنگ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ جو نیچے جھکا ریلنگ پر بازو ٹکائے اپنے پودوں کی نشوونما پر غور کر رہا تھا ایک دم چونک کر سیدھا ہوا۔

"دیکھیں' یہ میرے صفحات اڑ کر آپ کی بالکونی میں آگئے ہیں۔ پلیز ذرا یہ یہاں پھینک دیں۔"

زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر یہ جملے بولتے ہوئے اس کو اپنا آپ اچھا خاصا فضول لگا۔ رمیشہ کی بات سنتے ہی اس نے اپنے پیروں کے پاس پڑے ان کاغذات کو دیکھا اور فوراً" ہی جھک کر انہیں اٹھایا۔ اگلے لمحے اس نے انہیں فولڈ کر کے اس کی طرف اچھال دیا تھا۔

"تھینک یو۔" زمین پر سے صفحات اٹھا کر اس نے شکریہ ادا کیا تھا جواباً" وہ بندہ پرخلوص انداز میں مسکرا کر بولا تھا۔

"اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ فوراً" ہی اپنی چیزیں سمیٹ کر اندر کمرے میں چلی آئی تھی۔ اپنی یہ تین ایجز والی حرکت اسے بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔

"پتا نہیں اس نے میرے بارے میں کیا سوچا ہو گا ہو سکتا ہے وہ سوچ رہا ہو کہ میں نے جان بوجھ کر اس سے بات کرنے کے لیے یہ چیپ حرکت کی تھی۔" جو بھی تھا اس روز اسے خود پر سخت غصہ آیا تھا۔ اسے ہمیشہ سب کی نظر میں اچھا بننے کا شوق رہا تھا۔ کوئی اس کے بارے میں کسی قسم کے غلط اندازے لگائے یا اسے غلط سمجھے یہ بات وہ برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اپنے اس نئے پڑوسی سے رمیشہ کی دوبارہ ملاقات محض دو روز بعد ہی ہو گئی۔

اس روز وہ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر جلدی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ اچانک لائٹ چلے جانے پر گرمی اور حبس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کچھ دیر تو وہ یوں ہی بیڈ پر لیٹی کراچی کی گرمی اور لوڈشیڈنگ کو کوستی رہی' مگر پھر جب گھٹن اور گرمی حد سے زیادہ ہو گئی تو آخر کار بستر پر سے کھڑا ہونا ہی پڑا۔ ساری کھڑکیاں کھولنے کے بعد اس نے بالکونی کا دروازہ بھی کھول دیا۔ کمرے کے مقابلے میں باہر کا موسم قدرے غنیمت محسوس ہوا تو وہ بالکونی میں نکل آئی۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظر سامنے والی بالکونی میں پڑی تھی۔ کرسی پر ٹانگیں پھیلائے اسموکنگ کرتا ہوا وہ آسمان پر نظریں جمائے پتا نہیں کس سوچ میں غلطاں تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی رمیشہ نے واپس اندر کمرے میں جانے کی ٹھانی۔ ابھی وہ مڑنے ہی والی تھی کہ اچانک وہ اس طرف متوجہ ہوا۔

"ہیلو کیسی ہیں آپ؟" وہ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟" جب وہ حق ہمسائیگی نبھانے کے لیے خیروعافیت دریافت کر سکتا تھا تو رمیشہ بھی آخر اتنے مینرز تو رکھتی ہی تھی۔

"اس وقت تو بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوں۔ سارے دن کی تھکا دینے والی مصروفیت کے بعد اب گھر آکر لمبی تان کر سونے کا پروگرام اس لوڈشیڈنگ کی وجہ سے برباد ہو گیا ہے۔" وہ بڑی ناگواری سے بولا تھا۔

"آپ بھی اسی لوڈشیڈنگ کی ستائی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔" وہ دونوں ہاتھ ریلنگ پر جمائے بغور اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا تو رمیشہ نے سر ہلا دیا تھا۔

"بائی دا وے میں شہریار احمد ہوں۔ آپ کا نیا پڑوسی۔ قریباً" مہینہ بھر پہلے ہی یہاں شفٹ ہوا ہوں۔" وہ پیچھے مڑ کر میز پر رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ مسلتے ہوئے بولا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ واپس اپنی سابقہ پوزیشن میں کھڑا ہو گیا تھا۔

"میری فیملی شروع سے امریکہ میں رہتی ہے۔ پیدائش ویسے میری یہیں کی ہے۔ بعد میں ہم لوگ امریکہ مائیگریٹ کر گئے تھے۔ لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے تو ہم لوگ بھی اپنے اصل یعنی اپنے وطن واپس آگئے ہیں۔ ابھی صرف میں آیا ہوں۔ فیملی دو تین مہینوں میں یہاں شفٹ ہو جائے گی۔" وہ بڑی فرصت سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

"آپ نے اپنے گھر کی ڈیزائننگ کسی بہت ہی ماہر آرکیٹیکٹ سے کروائی ہے۔ آپ کا گھر ماشاءاللہ ہر زاویے سے ہی بڑا خوبصورت اور منفرد لگتا ہے۔" رمیشہ نے، بے ساختہ اس کے گھر کی تعریف کی تھی اور اس میں، مبالغہ آرائی کا ہرگز کوئی دخل نہ تھا' اس گھر نے اسے شروع دن سے متاثر کیا تھا۔

"بہت بہت شکریہ۔ ویسے یہ تمام کاوشیں میرے دوست احسان صدیقی کی ہیں۔ شاید آپ نے نام سنا ہو وہ یہاں کراچی میں بڑا مشہور آرکیٹیکٹ ہے۔ میں نے تو بس اس کی پلاننگ کو پسند کرنے کا کام کیا تھا۔ باقی تمام مراحل سے وہ خود ہی گزرا ہے۔ شیخ صاحب سے یہ مکان خریدنے کے بعد میں تو واپس چلا گیا تھا۔ پھر تمام ذمہ داری اسی نے نبھائی۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا اور رمیشہ اس کے اتنی

URDU PHOTO

روانی سے اور صحیح تلفظ کے ساتھ اردو بولنے پر حیران تھی۔ یہاں تو کوئی سال دو سال کہیں یا ہر ملک میں گزار آئے تو پھر منہ ٹیڑھا کیے بغیر بات ہی نہیں ہوتی اور اس کام میں مرد کسی بھی طرح خواتین سے پیچھے نہیں ہیں۔ جبکہ وہ تو ساری عمر باہر گزار کر آیا تھا۔

"کیا ہوا؟ آپ کیا سوچنے لگیں؟" وہ اس کی خاموشی محسوس کر کے بولا تھا۔

"کچھ نہیں، میں بس آپ کے اتنی روانی سے اردو بولنے پر حیران ہو رہی تھی۔" رمیشہ نے صاف گوئی سے اصل بات بتا دی تھی اور جواباً" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"ابھی اگر میں آپ کو یہ بتا دوں کہ مجھے علامہ اقبال کی شاعری اور شفیق الرحمان کا مزاح بہت پسند ہے تو پھر تو آپ شاید حیرت سے بے ہوش ہو جائیں گی۔" اس کے بے ساختہ انداز پر رمیشہ اپنے لبوں پر مچلنے والی مسکراہٹ کو روک نہیں پائی تھی۔

"ویسے میں سوچ رہا تھا کہ جب گھر والے آئیں گے، تب ہی اہل محلہ سے ہائے ہیلو ہو گی۔ مگر اس لائٹ کی مہربانی سے اپنے ایک عدد پڑوسی سے تو میں مل ہی لیا۔ بائی دا وے۔ آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" اس کے سوالیہ انداز پر وہ بولی۔

"میں رمیشہ ہوں۔ ہم لوگ تو شروع ہی سے یہیں رہتے ہیں۔ آپ اس بات سے اندازہ لگا لیں کہ ہماری امی شادی کے بعد رخصت ہو کر اسی گھر میں آئی تھیں۔ ہم تین بھائی بہن ہیں۔ سب سے بڑے بھائی مکینیکل انجینئر ہیں اور اسٹیل مل میں جاب کرتے ہیں۔ ان کے بعد میری بڑی بہن ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ جس وقت میں میٹرک میں تھی۔ ہمارے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب گھر میں، میں، امی، بھیا، بھابھی ان کے بچے اور میری بہن کے بچے، جو پڑھائی کی وجہ سے یہاں آئے ہوئے ہیں رہتے ہیں۔"

ابھی اس کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ لائٹ آ گئی۔

"اوہ تھینک گاڈ، لائٹ آ گئی۔" رمیشہ نے فوراً" شکر ادا کیا تھا۔ وہ سامنے کھڑا بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا شہریار صاحب، شب بخیر۔" وہ کمرے میں جانے کے لیے پر تولتے ہوئے بولی تھی۔ جواباً" وہ بھی شب بخیر کہتا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ سونے سے پہلے تک وہ اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ گو کسی کے بھی بارے میں فوراً" ہی کوئی رائے قائم کر لینا درست نہیں ہے، مگر اس بندے کے بارے میں اس نے پھر بھی رائے قائم کر ہی لی تھی اسے وہ اچھا لگا تھا۔ پڑھا لکھا، مہذب اور ملنسار۔ جب وہ خود اچھا ہے تو یقیناً" اس کی فیملی بھی اچھی ہو گی، چلو ہو سکتا ہے میری اس کی مسز سے اچھی دوستی ہی ہو جائے۔

سوچتے سوچتے پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ اپنے معمول کے مطابق شام میں بیٹھی لیکچرز تیار کر رہی تھی۔ جب اس نے شہریار کی آواز سنی۔

"السلام علیکم"۔ چونک کر سر اٹھایا تو وہ سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے سلام کا جواب دیتی وہ بھی جواب میں مسکرا دی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں بس یہ کل کے لیکچرز تیار کر رہی تھی۔" وہ سادگی سے بتا کر کرسی پر سے اٹھ آئی تھی۔

"آپ آج بڑی جلدی آ گئے۔" اچانک اس کے منہ سے نکل جانے والے اس جملے پر وہ شرارتی انداز میں گویا ہوا تھا۔

"آپ نے میرے آنے جانے کا ٹائم بہت یاد رکھا ہوا ہے۔" وہ ایک دم بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔ مگر اب وضاحت کرنی ضروری تھی ورنہ وہ پتا نہیں کیا سمجھتا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ دراصل میں روز یہاں بیٹھ کر اپنا کام کرتی ہوں، تو آپ کا پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اندر کوئی نہیں ہے۔"

اس کے وضاحتی انداز پر وہ دوبارہ ہنس پڑا تھا اور یہ ہنسی رمیشہ کو بہت بری لگی تھی۔ وہ اسے کیا سمجھ رہا

تھا۔ وہ تو صرف پڑوس نبھانے کی خاطر مروت میں اس سے بات کر رہی تھی اور موصوف ضرورت سے زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہو رہے تھے۔

"آپ پڑھتی ہیں یا پڑھاتی ہیں؟" وہ اس کی ناگواری محسوس کر گیا تھا اسی لیے فوراً" سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا تھا۔

"پڑھاتی ہوں۔ معاف کیجئے گا مجھے ذرا کچھ کام ہے۔" وہ بڑی بے مروتی سے کہہ کر اپنی چیزیں سمیٹ کر اندر چلی آئی تھی۔ جبکہ وہ ابھی بھی وہیں کھڑا نظر آ رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اریب کا ٹرمینل ایگزیمز کا رزلٹ بہت خراب آیا تھا۔ تمام مضامین میں بمشکل پاسنگ مارکس آئے تھے۔ جب سے اریب اور عاشی یہاں آئے تھے انہیں پڑھانے لکھانے کی ذمہ داری از خود رمیشہ کے سپرد تھی۔ پھر جب اس کے اتنی محنت سے پڑھانے کی وجہ سے دونوں اسکول میں اچھے گریڈز کے ساتھ پاس ہونے لگے تو بھابھی نے سنی اور عبداللہ کو بھی ٹیوشن سے اٹھا کر اسی کے حوالے کر دیا تھا۔ یوں اب تمام بچوں کو پڑھانا اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ اس کام میں اس نے کبھی کوتاہی بھی نہیں کی تھی۔ چاہے وہ کتنی بھی تھکی ہوئی ہوتی مگر بچوں کو پڑھانے کا ناغہ کبھی نہیں کرتی تھی۔

اپیا اور جواد بھائی کا بس نہیں چلتا تھا کہ بچوں کو آج ہی پی ایچ ڈی کروا دیں۔ ہر فون میں پہلے اس سے دونوں کی تعلیمی کارکردگی معلوم کی جاتی، اس کے بعد بچوں سے بھی پڑھائی ہی کے متعلق بات ہوتی۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ اس کے اتنی محنت کروانے کے باوجود بھی اریب اچھے مارکس نہیں لے پایا تھا۔ اس کی رپورٹ کارڈ دیکھ کر رمیشہ نے اریب سے اچھی خاصی سختی کے ساتھ باز پرس بھی کی تھی۔ بچوں سے دوستی اور پیار اپنی جگہ پڑھائی لکھائی کے معاملے میں وہ ایک سخت گیر استاد تھی۔

آج جب وہ کالج سے واپس آئی تو امی کی فون پر اپیا سے باتیں ہو رہی تھیں۔ دوپہر کے تین بج رہے تھے بھوک سے برا حال تھا۔ وہ امی کو سلام کر کے اپنے کمرے میں جانے لگی تو امی نے ریسیور اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ یہی سمجھی کہ اس کی آواز سن کر اپیا خیریت وغیرہ پوچھنا چاہ رہی ہیں۔ مگر دوسری طرف اپیا تو دوسرے ہی موڈ میں تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں رمیشہ! اریب کا رزلٹ دیکھا تم نے؟ میں تو ابھی تک اس کے مارکس سن کر سکتے میں ہوں۔ لگتا ہے اب کی بار تم نے صحیح سے محنت نہیں کرائی تھی۔ جواد کو پتا چلے گا تو وہ تو میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

اس کے سلام کا جواب دیتے ہی وہ نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھیں۔ عام طور پر وہ کسی بھی بات کا اتنی جلدی برا نہیں مانتی تھی، مگر اس وقت اسے اپیا کی بات بہت بری لگی تھی۔ شاید وہ تھکی ہوئی ابھی ابھی آئی تھی۔ گرمی اور بھوک سے پریشان ایسے میں اپیا کی بات اسے ضرورت سے زیادہ ہی بری لگی۔ اپنی ناگواری کو پی کر وہ چپ چاپ ہی کھڑی رہی تو وہ مزید بولیں۔

"اچھا دیکھو، اب فائنل ایگزیمز کے لیے اسے اچھی طرح تیاری کروانا۔ اگر میتھس انگلش اور سائنس میں اس کا اے گریڈ نہیں آیا تو جواد تو زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ تم ذرا اسے الگ سے زیادہ ٹائم دیا کرو۔ سب کو ایک ہی وقت میں پڑھاتی ہو۔ زیادہ وقت تو سب بچے آپس میں شرارتیں کرتے رہتے ہوں گے۔"

اپیا کا ہدایت نامہ سن کر وہ ریسیور امی کو دے کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اچھا خاصا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ کھانا کھائے بغیر ہی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اگر پہلی مرتبہ اریب کا رزلٹ خراب آیا تھا تو کیا اس کی قصوروار وہ تھی۔ اس سے پہلے جب ہر سال اریب اور عاشی شاندار مارکس لے کر پاس ہوتے تھے تو اپیا نے کبھی کریڈٹ اسے نہیں دیا تھا۔ کبھی اسے سراہا نہیں تھا۔ کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ ایسا

URDU PHOTO

اس کی محنت کی وجہ سے ہوا ہے۔ بلکہ ہر بار بچوں کے اچھے رزلٹ پر وہ فخر سے سر بلند کر کے کہتی تھیں۔

"کیوں نہ ہو۔ آخر کو ذہین ماں باپ کے جینیئس بچے ہیں۔ میرے بچوں کو ذہانت وراثت میں ملی ہے۔"

اور ان کی اس بات کا اس نے کبھی برا نہیں منایا تھا۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی ذہین بچے تھے۔ اس کی توجہ نے صرف ان کی ذہانت کو نکھارنے کا کام کیا تھا۔ اسے ابا کے بات کرنے کا انداز بہت برا لگا تھا' ایسا لگا تھا جیسے وہ کوئی تنخواہ دار ملازم ہے اور اسے تنخواہ اسی کام کی ملتی ہے۔ وہ تو اپنے انتہائی ٹائٹ شیڈول میں سے وقت نکال کر بچوں کو پڑھایا کرتی تھی اور ابا نے کتنی آسانی سے اس کی محنت کو دو ٹکے کا کر دیا تھا۔

شام میں سو کر اٹھی تو اسے یاد بھی نہیں تھا کہ وہ کتنے آف موڈ کے ساتھ سوئی تھی۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ اسے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ صاف دل کی مالک۔ زیادہ دیر کسی سے ناراض نہیں رہتی تھی۔ کسی کے خلاف دل میں کینہ یا بغض وہ رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ حسب معمول خوشگوار موڈ کے ساتھ سب گھر والوں کے ساتھ ہنسنے اور باتیں کرنے لگی تھی۔ مگر موڈ کی یہ خوشگواری زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی تھی۔

رات میں سونے سے پہلے امی کی کمر اور ٹانگیں دبانا اس کے معمول میں شامل تھا۔ وہ امی کی ٹانگیں دبا رہی تھی جب انہوں نے دوبارہ وہی قصہ چھیڑ دیا۔

"دریہ بہت ناراض ہو رہی تھی کہہ رہی تھی رمیشہ بچوں کو اچھی طرح توجہ نہیں دے رہی۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کچھ تو بہن کی پریشانی کا خیال کرو۔"

امی کے منہ سے یہ بات سن کر وہ بہت بد دل ہوئی تھی۔

"امی! آپ کے سامنے ہی تو ہے سب۔ میں روز تو پڑھاتی ہوں۔" وہ اپنی ناگواری چھپا کر آہستگی سے بولی تھی۔

"روز تو پڑھاتی ہو۔ مگر اتنی توجہ سے نہیں پڑھا رہیں۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت اریب کا رزلٹ ہی ہے۔ جو بچہ پہلے کلاس میں پوزیشن لیتا تھا' اب اچانک اتنا ڈفر کیسے ہو سکتا ہے۔" امی نے اس کا اعتراض یکسر رد کر دیا تھا۔

"تو اس کی کیا صرف یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ میں نے صحیح توجہ نہیں دی۔ ہو سکتا ہے کوئی اور وجہ ہو۔ اریب اب بڑا ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے ماں باپ کو مس کرتا ہو۔ میں نے ویسے بھی کئی بار نوٹ کیا ہے۔ جب بھیا سنی اور عبداللہ کے ساتھ گیمز کھیلتے ہیں یا باتیں کر رہے ہوتے ہیں اس وقت اریب کے چہرے پر بڑے ہی عجیب سے تاثرات ہوتے ہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولی تھی۔

"تو کیا جواد نوکری چھوڑ چھاڑ واپس آجائے۔ کیسی بے وقوفوں والی باتیں کرتی ہو تم۔" امی نے برا سا منہ بنایا۔

"تو وہ بچوں کو اپنے پاس بلا لیں اور اگر ایسا نہیں کرنا چاہتے تو کم سے کم ابا کو تو اپنے بچوں کے پاس رہنا چاہیے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کیسی ماں ہیں' وہ انہیں اپنے بچوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ سال میں دو تین مرتبہ مل لینے سے کیا ان کے دل کی تسلی ہو جاتی ہے۔"

اب جب بات ہو ہی رہی تھی تو وہ اپنے دل کا یہ خیال امی کے سامنے ظاہر کر گئی تھی اور اس کی یہ بات امی کو بہت بری لگی۔

"یہ بات تمہاری بھاوج کہتی تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوتا کہ نند بھاوج کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ پتا ہے' بہنوئی کے مزاج کا پھر بھی یہ بات کہہ رہی ہو۔ پہلے ہی جواد کی بہنیں' دریہ کے خلاف اس کے کان بھرتی رہتی ہیں' اگر وہ وہاں سے آگئی تو یہ میدان خالی چھوڑ دینے والی بات ہو گی بجائے بہن کی پریشانی کا خیال کرنے کے تم الٹا بہن کو مورد الزام ٹھہرا رہی ہو۔ ٹھیک ہے مت پڑھاؤ تم' میں خود ہی بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی انتظام

کر دوں گی' ٹیوشن پڑھانے والوں کی کمی نہیں ہے۔"

امی نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے غصے سے کہا تھا۔

پھر کتنی ہی دیر وہ امی سے سوری کرتی رہی' اپنی بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ انہیں بتانا چاہا کہ وہ ایسا کسی بری نیت سے نہیں کہہ رہی تھی' مگر ان کا غصہ اپنی جگہ برقرار رہا۔ تھک ہار کر وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے ہمیشہ محسوس کیا تھا۔ امی ابا کو اس کے اور بھیا کے مقابلے میں زیادہ چاہتی ہیں۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب یہ بات اس نے بہت شدت سے محسوس کی تھی۔ بہت دفعہ اسے برا بھی لگا تھا مگر پھر ہر بار اپنی عادت کے پیش نظر وہ اس بات کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ وہ دن رات ایک کر کے امی کی خدمت کرتی تھی اور یقیناً" ایسا کر کے وہ ان پر کوئی احسان نہیں کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی اس کا دل چاہتا۔ امی کوئی ستائشی جملہ اور شاباش ہی اسے دے دیں۔ اس کی پیٹھ تھپک کر یہ ہی کہہ دیں۔

"رمیشہ میری سب سے پیاری بیٹی ہے۔" یا یہ کہ "رمیشہ تھوڑا آرام بھی کر لیا کرو۔ کتنا تھک جاتی ہو گی تم۔" مگر اس کی حسرت' حسرت ناتمام ہی رہی تھی۔ اس کے برعکس اگر وہ ابا سے فون پر صرف یہی سن لیتیں کہ آج رات ان کے گھر کھانے پر مہمان آرہے ہیں تو وہ بری طرح بے چین ہو جاتی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ خود اڑ کر ابا کے گھر پہنچ جائیں اور ان کا ہاتھ بٹائیں۔ عید وغیرہ پر ابا پاکستان آتیں اور ان دو چار دنوں کے قیام میں امی کی خدمت کرتیں تو امی پریشان ہو جاتیں۔

"بس کرو کب سے پیر دبا رہی ہو۔ تھک گئی ہو گی۔"

اور وہ حیرت سے امی کا منہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ اس طرح انہوں نے اسے کبھی نہیں کہا تھا۔ اس کے برعکس اگر کبھی اس سے کہیں کوئی معمولی سے چوک بھی ہو جاتی تو وہ جواب طلبی کے لیے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ اگر وہ ناشتہ دیر سے لے کر جاتی تو وہ ناراض ہو جاتی تھیں اسے طعنہ دیتی تھیں۔

"ہاں ہاں بیمار ماں سے تنگ آگئی ہو۔ میرا وجود تو اب وبال جان لگتا ہے تمہیں۔"

اور وہ انہیں منا منا کر ہار جاتی تھی۔ جب تک بابا زندہ تھے اس نے کبھی امی کی ابا سے انتہائی محبت کو اتنا محسوس نہیں کیا تھا۔ کیونکہ بابا کی تو وہ لاڈلی تھی۔ مگر بابا' امی کی طرح بچوں میں فرق نہیں رکھتے تھے۔ اگر وہ ان کی آنکھوں کا تارا تھی تو ابا اور بھیا بھی انہیں کم عزیز نہ تھے۔ امی کی بات نے اسے بہت بری طرح ہرٹ کیا تھا۔ اس کے خلوص اور نیت پر شبہ کیا جائے۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ بالکونی میں کھڑی آسمان پر چمکتے اس تارے کو بغور دیکھتے وہ اس وقت بڑی دل گرفتہ اور اداس تھی۔ اس وقت اسے بابا بڑی شدت سے یاد آرہے تھے۔

"آپ شاید اپنے والد کو مس کر رہی ہیں۔" شہریار کی اس بات پر وہ بری طرح چونک گئی تھی۔

"حیران مت ہو۔ ابھی جب آپ خود کلامی کر رہی تھیں تو میں نے آپ کی بات سن لی تھی۔" اس کی حیرت کے جواب میں وہ فوراً" بولا تھا۔

"اور اسی بات نے مجھے یہاں کھڑا رہنے پر مجبور کیا تھا۔ میرے پاپا بھی میرے بچپن ہی میں ہمیں چھوڑ گئے تھے۔ میں بھی انہیں آپ ہی کی طرح مس کرتا ہوں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "لیکن آپ اس طرح کیوں سوچتی ہیں۔ آپ اکیلی تو نہیں ہیں۔ آپ کی والدہ' بہن بھائی اور یقیناً" بہت سے فرینڈز تو آپ کے پاس ہیں اور ان فرینڈز میں تازہ ترین اضافہ میں ہوں۔"

رمیشہ بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہم فرینڈز نہیں ہیں؟" اس کی حیرت کے جواب میں وہ سوالیہ انداز میں بولا تھا اور اسے محض مروت میں گردن ہلانی پڑی۔

"چلیں شکر' آپ نے یہ بات تو تسلیم کی۔ اب یہ بتائیں کس بات نے آپ کو اتنا ڈپریس کیا ہے۔" وہ دوستانہ مسکراہٹ سمیت بولا تھا۔

URDU PHOTO

"کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس ویسے ہی بابا یاد آنے لگے تھے۔" وہ وضاحتی انداز میں بولی تو شہریار گردن ہلا کر بولا۔

"کوئی بات نہیں تھی تو پھر تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ اچھا اس ذکر کو چھوڑیں' یہ بتائیں آپ کیا پڑھاتی ہیں اور کس کو پڑھاتی ہیں۔ اس دن تو آپ روٹھ کر چلی گئیں اور تعارف ادھورا رہ گیا تھا۔"

وہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے دیکھ رہا تھا اور اپنا اس روز کا ردعمل اب رمیشہ کو بڑا ہی بچکانہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے شرمندہ سے لہجے میں بولی۔

"میں ناراض تو نہیں ہوئی تھی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" اور جواب میں وہ اپنے مخصوص انداز میں بے فکری سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"چلیں مان لیا۔ آپ ناراض نہیں ہوئی تھیں۔ اب میرے سوال کا جواب بھی دے دیں۔" وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے جینٹکس میں ماسٹرز کرنے کے بعد سروس کمیشن کا ایگزیم دیا تھا۔ دراصل مجھے شروع ہی سے ٹیچنگ پروفیشن بہت پسند ہے۔ لیکچر شپ میرا خواب تھا جو اللہ تعالیٰ نے پورا کروا دیا۔ میں گورنمنٹ کالج میں تھرڈ ایئر اور فورتھ ایئر کی اسٹوڈینٹس کو بوٹنی اور زولوجی پڑھاتی ہوں۔" اس کے جواب میں وہ ستائشی انداز میں بولا۔

"زبردست بھئی' اس کا مطلب ہے اب پاکستان میں بھی لڑکیاں اپنے کیریر اور پروفیشن کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگی ہیں۔ بھئی یہ تو بہت ہی پوزیٹو چینج ہے۔"

"میں نے اپنا تو پورا بائیو ڈیٹا بیان کر دیا۔ آپ نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا۔" کچھ دیر پہلے کا موڈ ایک دم بدل گیا تھا وہ بڑے آرام سے کھڑی اس سے یوں باتیں کر رہی تھی۔ جیسے یہاں آکر کھڑی ہی اسی لیے ہوئی تھی۔

"میں نے سی اے کیا ہے۔ وہاں ڈلاس میں اچھی مناسب قسم کی جاب کر رہا تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے پاکستان سے بہت اچھی جاب بڑے معقول معاوضے اور دیگر سہولتوں کے ساتھ آفر ہوئی تو میں نے انکار یوں نہیں کیا کہ ایک تو چینج ہی بہت اچھا تھا۔ فرم کی اپنی ریپوٹیشن بھی بہت اچھی ہے اور دوسرے یہ کہ میری ممی کو بھی اب اپنا ملک کو بڑی شدتوں سے یاد آنے لگا تھا۔ تین چار سال سے وہ اٹھتے بیٹھتے پاکستان کی عیدیں' رمضان اور دیگر تہوار بے تحاشا یاد کرنے لگی تھیں۔ اب میں اتنا محب وطن تو ہوں نہیں کہ فوراً" پاکستان آجاتا اور یہاں آکر نوکری کی تلاش کرتا۔ مگر جب اتنی اچھی جاب آفر ہوئی وہ بھی اپنے ملک میں اور اتنی ساری سہولتوں کے ساتھ تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں پر جس جگہ جاب کرتا تھا وہاں کانٹریکٹ کی مدت جیسے ہی ختم ہوئی' میں نے واپسی کی راہ لی۔ اس دوران یہ گھر وغیرہ میری ممی کی فرمائش پر بنا ہے۔ میرے چھوٹی بھائی کا فائنل سمسٹر ہو جائے تو وہ لوگ بھی یہاں آجائیں گے۔" وہ بڑی تفصیل سے اپنے بارے میں بتا کر خاموش ہوا تو رمیشہ بے ساختہ بولی۔

"اور آپ کی مسز اور بچے وغیرہ۔"

"دعا کریں' وہ بھی آجائیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیوں کیا وہ پاکستان آنے پر راضی نہیں ہیں؟" رمیشہ نے سوالیہ انداز میں کہا' پھر اس کے جواب دینے سے پہلے خود ہی بولی۔ "ویسے انہیں ایسا کرنا نہیں چاہیے۔ آپ لوگوں کے پاس تو یقیناً" امریکن نیشنیلٹی ہوگی۔ اگر کسی وجہ سے یہاں ایڈجسٹ نہ کر سکے تو واپس جانے کا آپشن تو بہرحال موجود ہے ہی۔ انہیں آپ کے پاس آکر رہنا چاہیے۔" اس کے ان ہمدردانہ جملوں پر وہ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولا۔

"آپ کے بارے میں میری پہلی رائے بالکل ٹھیک تھی' آپ ایک بہت ہی ہمدرد اور نیک دل خاتون ہیں۔"

اور اپنی اس تعریف پر وہ ایک دم مسکرا دی۔

"میرا خیال ہے رات کافی ہو گئی ہے اور ہم دونوں

صبح سویرے اٹھنا ہے۔" شہریار کے کہنے پر اسے وقت کا احساس ہوا تو شب بخیر کہتی اندر کمرے میں

سونے کے لیے لیٹی تو اس کے دل پر کوئی بوجھ نہیں اس وقت شہریار کا ملنا اور باتیں کرنا بڑا غنیمت ہوا "اس کے باتیں کرنے کا انداز کتنا اچھا ہے۔ وہ اپنائیت اور خلوص سے بولتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی بہت اپنا ہو۔ اجنبیت یا غیریت کا احساس نہیں ہوتا۔" وہ سونے سے پہلے تک اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اگلے روز امی کو کتنے جتن کر کے منایا یہ ایک الگ داستان تھی۔ امی کو خوش کرنے کے لیے بچوں کو بھی روزانہ سے زیادہ دیر تک پڑھاتی رہی۔ کمرے میں آکر بھی وقت گزاری کے لیے کمپیوٹر آن کر کے بیٹھ گئی۔ کمپیوٹر میں ماسٹر تھا۔ وہی اسے مختلف چیزیں سکھاتا رہتا تھا۔ خود اسے اس بارے میں بس بنیادی باتیں ہی معلوم تھیں۔ اپنے مطلب کے Softwares وغیرہ سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتی تھی وہ اپنے کام میں مگن تھی' جب کوئی چیز آکر کھڑکی کے شیشے سے ٹکرائی تھی۔ رمیشہ نے فوراً" مڑ کر دیکھا تو کھڑکی کے کھلے پردوں سے اسے بالکونی میں کھڑا شہریار نظر آیا۔ وہ اٹھ کر باہر بالکونی میں آئی۔ ٹانگز پر پڑا وہ چھوٹا سا پتھر الگ ہی نظر آرہا تھا۔

"یہ آپ نے پھینکا ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں میں نے پھینکا ہے۔ آپ کو متوجہ کرنے کا اور کوئی مہذب طریقہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔" وہ صاف گوئی سے اقرار کر گیا۔

"بڑی فضول حرکت کی ہے آپ نے' اگر شیشہ ٹوٹ جاتا تو کتنا نقصان ہوتا۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"بے فکر رہیں۔ ٹوٹا تو نہیں نا۔ ویسے میں نے چھوٹے کا نشانہ لیا تھا۔ افسوس میرا نشانہ چوک گیا۔ خیر کوئی نقصان ہوا تو نہیں۔" وہ بڑے آرام سے بولا تو رمیشہ کو دھیان آیا کہ اسے کام کیا تھا۔

"آپ کو مجھ سے کیا کام تھا؟"

"کام کوئی نہیں تھا بس میں بور ہو رہا تھا۔ آپ پر نظر پڑی تو میں نے کہا چلو آپ ہی کے کان کھائے جائیں۔ ویسے کمپیوٹر پر کیا کام ہو رہا تھا۔" وہ بالکونی کے کھلے دروازے سے نظر آتے مانیٹر پر نظریں مرکوز کیے بولا۔

"کچھ نہیں۔ یوں ہی ٹائم پاس کر رہی تھی۔ دراصل مجھے کمپیوٹر کے بارے میں اتنا پتا نہیں ہے آج کل اپنے بھتیجے سے سیکھ رہی ہوں۔" وہ جواب میں بولی۔

"ایک دم بے وقوف ہے آپ کا بھتیجا۔ 2001ء میں آپ سے window-96 پر کام کروا رہا ہے۔ میڈم وقت کے ساتھ چلنا سیکھیں۔ سیکھ ہی رہی ہیں تو windows کے نئے ورژن پر سیکھیں۔ اچھا ایک منٹ ٹھہریں' میں ابھی آتا ہوں۔"

اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ اندر کمرے میں چلا گیا تھا۔ رمیشہ وہیں کھڑی اس کا انتظار کرتی سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرنے گیا ہے۔ پانچ منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔

"یہ لیں یہ سی ڈی میں آپ کی طرف اچھال رہا ہوں۔ براہ مہربانی اسے پاکستانی فیلڈرز کی طرف ڈراپ مت کر دیجئے گا۔ جیسے اس دن آپ اپنے پیپرز کا کیچ نہیں پکڑ سکی تھیں۔ چلیں' وہ تو کاغذ تھے بچت ہو گئی تھی۔ آج مشکل ہو جائے گی۔"

"لیکن میں اس کا کیا کروں گی؟" وہ فوراً" بولی۔

"کرنا کیا ہے اس کا اچار ڈال کر کھائیے گا۔ بھئی اس سی ڈی میں windows کا نیا ورژن ہے۔ اسے install کریں اور مجھے دعائیں دیں۔ اچھا یہ پکڑیں۔"

اگلے پل وہ بمشکل سی ڈی پکڑ پائی تھی۔

"شاباش' آپ میں ایک اچھا فیلڈر بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔" وہ اسے سراہ رہا تھا۔

"آپ کو یہ جلدی واپس تو نہیں جانا ہے۔ ابھی تو سنی اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے گیا ہے' جب

URDU PHOTO

آئے گا تب اس سے install کراؤں گی۔" اس کی بات پر شہریار برا سا منہ بنا کر بولا۔

"اتنا پڑھ لکھ کر آپ اتنا سا کام بھی خود نہیں کر سکتیں' افسوس ہو رہا ہے مجھے۔ جو کام آپ کا بھتیجا کر سکتا ہے' وہ آپ کیوں نہیں۔ چلیں آپ اسے خود install کریں میں آپ کو گائیڈ کر رہا ہوں۔"

اس کی بات پر رمیشہ اندر کمرے میں آ گئی اور سی ڈی لگا کر اس کے اگلے احکامات سننے واپس باہر آئی تھی۔ پھر اسے اچھی طرح سب سمجھا کر وہ یہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"اوکے' اب رات میں ملاقات ہو گی۔ پھر میں آپ سے پوچھوں گا۔ کیا ہوا یا کیا نہیں ہوا۔" خود کرنے بیٹھی تو پتا چلا یہ کوئی اتنا بڑا یا انوکھا کام نہیں تھا' جو وہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بڑے آرام سے اس نے یہ کام کر لیا تھا اور یہی بات رات اس نے شہریار سے کہی تھی۔

"یہی تو میں آپ سے کہہ رہا تھا۔ بلاوجہ اتنے سے کام کو آپ ہوا سمجھ رہی تھیں۔"

وہ چیونگ گم منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔ پھر کچھ خیال آنے پر اس سے بولا۔

"لیں آپ بھی کھائیں۔" وہ انکار کرنے ہی والی تھی کہ اس نے چیونگم اس کی طرف اچھال دی۔

"شکریہ۔" چیونگ گم ہاتھ میں لے کر اس نے شکریہ ادا کیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس کی کولیگ مسز عباسی کی بیٹی کی شادی تھی۔ عام طور پر وہ فنکشنز وغیرہ میں جانے کی بہت چور تھی۔ مگر مسز عباسی کے محبت بھرے اصرار کے سامنے اسے حامی بھرنی ہی پڑی تھی۔ عبداللہ کی منت سماجت کر کے اسے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ وہاں پہنچ کر مسز عباسی کو مبارک باد دینے کے بعد وہ اپنی دیگر کولیگز کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ ابھی بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کسی نے بڑی بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ رمیشہ نے مڑ کر دیکھا تو سامنے کھڑی فروا کو فوراً" ہی پہچان گئی تھی۔ وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور اگلے پل دونوں ایک دوسرے کو گلے لگائے خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ فروا اور وہ کالج تک ایک ساتھ رہی تھیں۔ پھر بی ایس سی کے بعد جب فروا کے پاپا کا اسلام آباد ٹرانسفر ہو گیا تو ان دونوں کا آپس میں رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں خط و کتابت وغیرہ ہوئی' مگر پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور دونوں ایک دوسرے سے دوبارہ کبھی نہ مل سکیں۔

"فروا موٹی! بالکل ویسی کی ویسی ہو۔ مجھے پہچاننے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی۔" رمیشہ اس کے ہاتھ تھام کر بڑے خوشگوار انداز میں بولی تو وہ بے فکری سے قہقہہ لگا کر بولی۔

"تم بھی بالکل نہیں بدلیں۔ وہی شاہانہ انداز' وہی چہرے پر مغلیہ دور کی شہزادیوں والی تمکنت۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا تھا کہ یہ ہماری پرنس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

فروا کے ان الفاظ پر وہ ایک دم جھینپ گئی تھی اور وہ اس کی شکل دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"ابھی تک ویسی کی ویسی ہو۔" اس کی تمام کولیگز بڑی دلچسپی سے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ رمیشہ کو ہی اس بات کا خیال آیا تو ان لوگوں کا فروا سے تعارف کروایا۔ سب سے دعا سلام کرنے کے بعد فروا بھی وہیں ان لوگوں کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"فرسٹ ایئر سے لے کر بی ایس سی فائنل تک ہم لوگ ایک ساتھ رہے۔ رمیشہ ہمارے کالج کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ ویسے تو اور بھی بہت سی لڑکیاں تھیں جو کافی خوب صورت تھیں مگر اس کی بات ہی اور تھی۔ اس کا تو انداز ہی شاہانہ تھا۔ آپ لوگ یقین کریں میں نے اس سے دوستی بھی صرف اس کی خوب صورتی کی وجہ سے کی تھی۔"

فروا اپنے مخصوص سادہ انداز میں بولی تو وہ شرمندہ سے لہجے میں اسے ٹوکنے لگی۔

"کیا فضول باتیں کر رہی ہو تم۔"

"کوئی فضول بات نہیں ہے یہ۔ میں تمہاری کولیگز کو تمہاری مقبولیت کے بارے میں بتا رہی ہوں۔ ہمارے کالج کے سالانہ فنکشن میں شیکسپیئر کا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا تھا۔ اس میں قلوپطرہ کے رول کے لیے کتنی ساری لڑکیوں نے ہاتھ پاؤں مارے' ٹیچرز کی خوشامد کی۔ مگر ہماری ڈرامے کی ٹیچر نے صاف صاف کہہ دیا قلوپطرہ' رمیشہ کے علاوہ اور کوئی نہیں بنے گی۔ رمیشہ تمہارے پاس رکھی ہیں اس کی تصویریں۔ میں نے تو اب تک سنبھال کر رکھی ہیں۔"

فروا نان اسٹاپ بولنے میں مصروف تھی اور اس کی تمام کولیگز ہی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

"اچھا رمیشہ نے ہمیں یہ سب کبھی نہیں بتایا۔" مسز انصاری نے بے ساختہ کہا تو فروا بولی۔

"ابھی تو میں آپ کو اور بھی بہت سی باتیں بتاؤں گی جو اس نے یقیناً" آپ لوگوں سے چھپائی ہوں گی۔ اسی فنکشن کی تصویریں دیکھ کر میرا کزن دل و جان سے محترمہ پر فدا ہو گیا تھا۔ وہ تو پرپوزل بھیجنے کے لیے پوری طرح تیار تھا مگر یہ اڑ گئیں کہ ابھی تو مجھے بہت پڑھنا ہے' ماسٹرز کرنا ہے وغیرہ وغیرہ اور وہ بے چارہ مایوس اور ناکام واپس لندن چلا گیا۔"

فروا کی ان باتوں پر وہ در حقیقت شرمندہ ہو رہی تھی مگر سچویشن کچھ ایسی تھی کہ اسے ٹوک بھی نہیں سکتی تھی۔

"ارے تمہارے میاں کہاں ہیں۔ مجھے ملواؤ میں بھی تو دیکھوں پرنسز کے پرنس آخر ہیں کیسے؟" فروا کی اس بات پر وہ ایک لمحے کے لیے بالکل چپ رہ گئی تھی۔ وہ جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بھئی پرنس ابھی تک ہماری زندگی میں آئے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے آپ کو ان سے نہیں ملوایا جا سکتا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خود کو کمپوز کرتی فوراً" مسکراتے ہوئے بولی اور فروا حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی ایک دو منٹ کی حیرت کے بعد وہ اس سے بولی۔

"اچھا آؤ میں تمہیں اپنے شوہر اور بچوں سے ملواؤں۔" وہ فروا کے ساتھ اس کے شوہر سے ملنے کے لیے اپنی کولیگز سے ایکسکیوز کرتی اٹھی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھی۔

"رمیشہ! کیا واقعی تمہاری شادی نہیں ہوئی؟" فروا اس طرح بولی جیسے یہ بڑی ہی ناقابل یقین بات تھی۔

"ہاں۔" اس کا جواب بڑا مختصر تھا۔

"مگر کیوں تمہارے لیے تو اس وقت کالج کے دنوں ہی میں کتنے پرپوزلز آیا کرتے تھے۔ کالج ہی کی کتنی لڑکیاں اپنے بھائیوں کے لیے تمہارے گھر آئی تھیں' پھر ایسی کیا بات ہوئی کہ تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ کیا ان سب میں سے کوئی ایک بھی تمہاری معیار کا نہیں تھا۔" ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اس بات سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔

"بس یہی سمجھ لو۔" وہ پھر گول مول جواب دے کر خاموش ہو گئی تھی۔ فروا نے اس کا اپنے شوہر سے تعارف کروایا تو وہ بڑی خوش اخلاقی سے رمیشہ سے ملا۔ اپنے گھر آنے کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی۔

فروا کے دو بچے تھے۔ بڑی بیٹی چار سال کی تھی اور بیٹا دو ڈھائی سال کا۔ اس کے بچے بھی اسی کی طرح صحت مند اور سرخ و سفید تھے۔ باقی وقت رمیشہ' فروا اس کے شوہر اور بچوں ہی کے ساتھ رہی تھی۔ رمیشہ نے محسوس کیا کہ فروا اس سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے مگر شاید اپنے شوہر کی وجہ سے پوچھ نہیں پا رہی۔ وہ کیا پوچھنا چاہتی تھی یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی۔

اس روز فروا وغیرہ سے رخصت ہو کر جب وہ گھر واپس آئی تو ایسا لگ رہا تھا جیسے دل پر کوئی بوجھ ہو۔ اپنا آپ بڑا خالی خالی اور اکیلا لگا تھا۔ فروا کے بچوں کو دیکھ کر اسے عجیب سی کمی کا احساس ہوا تھا۔ ایک ایسی بات جسے آپ لاشعوری طور پر محسوس کرتے ہوں' مگر

خود سے بھی اس کا اظہار نہ کریں۔ وہی بات کسی اور کے منہ سے سن کر وہ چیز زیادہ ہی محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

اپنے کمرے میں آکر وہ کتنی ہی دیر تک کھڑی خود کو آئینے میں دیکھتی رہی تھی۔ فروا کے یاد دلانے پر اسے کالج اور پھر یونیورسٹی کی کتنی ہی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ اس کی فرینڈز اس کے پیچھے لگی رہا کرتی تھیں۔

"تم بال کس چیز سے دھوتی ہو ہمیں بھی بتاؤ۔ تمہاری اسکن اتنی اچھی اور فریش کیسے ہے۔ تم کون سا ماسک لگاتی ہو؟۔"

اور وہ انہیں لاکھ یقین دلاتی کہ وہ کسی قسم کی کوئی کیئر نہیں کرتی مگر انہیں کبھی بھی یقین نہیں آتا تھا۔ پھر جب فروا کے کزن نے اسے پسند کر کے پرپوز کرنے کی بات کی تھی تو اس کی فرینڈز اس پر رشک کر رہی تھیں اور رمیشہ نے بجائے خوش ہونے کے ناگواری کا اظہار کیا تھا۔

"مجھے ابھی بہت پڑھنا ہے۔ اپنے کزن سے کہو میرا پیچھا چھوڑ دے۔" بعد میں جب فروا کا کزن واپس لندن چلا گیا تو سب فرینڈز نے بڑا افسوس کیا تھا۔ پھر اس کا مطمئن اور پرسکون انداز دیکھ کر سب ہی کو یقین کرنا پڑا تھا کہ وہ من نہیں رہی تھی اسے در حقیقت فروا کے کزن سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کلثوم اس کی بیسٹ فرینڈ جس نے ماسٹرز اس کے ساتھ ہی کیا تھا اکثر کہا کرتی تھی۔

"دیکھ لینا' وہ کوئی بہت ہی منفرد سا بندہ ہو گا جسے اللہ تعالیٰ نے اسپیشلی تمہارے ہی لیے بنایا ہو گا۔ جب وہ آئے گا تو تم یہ انکار و نکار اور یہ اترانا سب بھول جاؤ گی۔ وہ یونانی دیوتاؤں کی سی آن بان والا آئے گا اور آ کر تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

اور وہ اس کی ان پیشن گوئیوں پر ہنس دیا کرتی تھی۔ پھر ایک ایک کر کے اس کی تمام فرینڈز کی شادیاں ہوتی چلی گئیں اور شادی کے بعد کی مصروفیات میں لگ کر آپس میں میل ملاپ بھی بہت ہی کم رہ گیا تو وہ یہ تمام باتیں بھی وقت کے ساتھ ساتھ بھولتی چلی گئی۔ آج ماضی کے اوراق پلٹنے کھڑی ہوئی تو گزرے وقت کی ایک ایک بات یاد آتی چلی گئی۔

اپنے ایم ایس سی مکمل کرنے تک تو وہ کسی بھی قیمت پر شادی کے لیے تیار نہ تھی اسے اپنا کیریر بنانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ ان دنوں اس کے لیے بے تحاشا رشتے آیا کرتے جنہیں امی ریجیکٹ کر دیا کرتیں۔ اڑتی اڑاتی اس قسم کی خبریں اسے پتا چل ہی جاتی تھیں۔ وہ کسی یا محلے کے میلاد وغیرہ میں بھی جاتی تو اکثر بعد میں وہاں سے اس کے لیے کوئی نہ کوئی رشتہ آجاتا۔ ان دنوں عاشی اور اریب نئے نئے ان لوگوں کے پاس آئے تھے۔ رمیشہ کا زیادہ وقت یا تو بچوں کے ساتھ گزرتا یا پھر گھر کی صفائی اور کھانا وغیرہ پکانے میں۔ پھر جب اس کا ایم ایس سی کا رزلٹ نکلا اور وہ فرسٹ ڈویژن کے ساتھ کامیاب بھی ہو گئی تو اس نے پبلک سروس کمیشن کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ اپیا کے بچے' بھیا کے بچے' امی کی دیکھ بھال اور گھر کا تمام کام کاج جو وہ پہلے یونیورسٹی کے دنوں میں بھی بڑی ذمہ داری سے کرتی تھی اب اور زیادہ لگن سے تمام کام کرنے لگی تھی۔ امی کو اس وقت کمر وغیرہ کی تو کوئی تکلیف نہ تھی' مگر ان کا بلڈ پریشر اکثر خطرناک حد تک ہائی رہتا تھا اس لیے وہ زیادہ کام وغیرہ نہیں کر سکتی تھیں۔

آہستہ آہستہ بھابی نے تمام ذمہ داریاں اس کے کاندھوں پر ڈال دیں اور خود گھر کے بیشتر کاموں سے بری الذمہ ہو گئیں۔ وہ خوشی خوشی ہر ذمہ داری قبول کرتی چلی گئی۔ وقت گزرتا رہا۔ بے تحاشا آنے والے رشتوں میں بتدریج کمی آنے لگی۔ مگر ان کبھی کبھار کے آنے والوں کو بھی کچھ نہ کچھ کہہ کر امی ریجیکٹ کر دیا کرتیں۔ ایک دو بار ایسا ہوا کہ امی راضی ہو گئی اور ایسے میں اپیا کا فون آگیا اور انہوں نے تمام تفصیلات جان کر کہا۔

"امی! کیا ہو گیا ہے آپ کو کیا ہماری نازوں پلی حسین بہن کے لیے اتنے فضول قسم کے رشتے ہی رہ

URDU PHOTO

گئے تھے۔ ایسی بھی کوئی اس کی عمر نہیں گزری جا رہی۔ ذرا صبر سے کام لیں ان لوگوں کو۔"

اور امی جھٹ ان لوگوں کو انکار کر دیا کرتیں۔ کبھی معاملہ اس حد تک بڑھا ہی نہیں کہ اس کی رائے معلوم کرنے کی نوبت آتی۔ پہلے ہی مرحلے پر انکار ہو جاتا اور بات وہیں ختم۔

شروع شروع میں رمیشہ نے اس بات کو زیادہ محسوس بھی نہیں کیا۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ اسے احساس ہوا کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہے۔ وہ صاف دل کی لڑکی تھی۔ اسے لوگوں کی چالاکیاں' مکاریاں اور چھل فریب والی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر اتنا تو اس نے محسوس کر ہی لیا تھا کہ ہر بار انکار کروانے میں سب سے اہم کردار اپیا کا ہوتا ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتی تھیں۔ یہ بات سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔

شروع میں ایک دو بار بھیا نے امی کو سمجھانے کی کوشش کی مگر امی الٹا ان ہی پر چڑھ دوڑیں۔

"ہاں ہاں بہن کا وجود بوجھ لگنے لگا ہے۔ سب پتا ہے مجھے۔ یہ کس کی زبان بول رہے ہو تم۔"

اور امی کے اس طعنے پر بھیا بے چارے فوراً" چپ ہو گئے تھے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اس معاملے میں کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ بھابھی اس معاملے میں خاموش تماشائی تھیں۔

اب تو وہ کبھی کبھار کے بھولے بھٹکے آنے والے بھی تقریباً" ختم ہی ہو گئے تھے۔ گھر میں کسی کے بھی منہ سے اس نے کبھی اپنی شادی کی باتیں نہیں سنی تھی۔ اس کی ایک دو کولیگز جن کی شادیاں لیٹ ہو گئی تھیں اسے بتاتی تھیں کہ ان کی مائیں ان کی شادیوں کے لیے سخت پریشان ہیں۔

"میری امی تو میرے لیے "یا لطیف" کا وظیفہ پڑھ رہی ہیں۔" ایک بتاتی تو دوسری کہتی۔

"میری امی سورہ فاتحہ روز عشاء کی نماز کے بعد پڑھ کر میرے رشتے کے لیے دعا کرتی ہیں۔"

اور وہ حیرت سے انہیں دیکھ کر رہ جاتی۔ یہاں تک کہ ایک دو بار بھابھی نے سمیعہ کی منگنی وغیرہ کی بات کی تھی' مگر اس کا کہیں ذکر نہیں ہوا تھا۔ اس کے سامنے کی بچی کا رشتہ اس کے ماں باپ طے کرنے والے تھے اور وہ خود؟ یہ کیسی زندگی تھی' کتنی اکیلی کتنی خاموش۔ اس کی دوستیں کہا کرتی تھیں۔

"تمہارے میاں کو تو کبھی تم پر غصہ ہی نہیں آیا کرے گا۔ جب ہم لڑکیاں ہو کر تم پر دل و جان سے عاشق رہتی ہیں تو وہ تو بس تمہارا دیوانہ ہو گا۔ تم اسے اپنے انگلیوں پر نچایا کرنا۔"

اور وہ ان لوگوں کی باتوں پر مسکرا کر رہ جایا کرتی تھیں۔ آج فروا کے ملنے پر اسے کتنی ہی گزری باتیں یاد آگئی تھیں۔ وہ باتیں جنہیں وہ اپنی زندگی کی مصروفیات میں کھو کر بھول چکی تھی۔ وہ بھول چکی تھی کہ وہ بھی ایک زندہ وجود ہے جس کے اپنے جذبات اور احساسات ہیں۔ جو زندگی میں اپنے لیے بہت کچھ چاہتا ہے۔ وہ اپنی ان سوچوں سے گھبرا کر ایک دم آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"کہاں غائب تھیں نیک دل خاتون! میں تو اب اخبار میں تلاش گمشدہ کا اشتہار دینے ہی والا تھا۔"

وہ آج پورے چار دن کے بعد اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی کام کر رہی تھی۔ شہریار سے آمنا سامنا ہونے پر دعا سلام ہوئی اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہی اس نے اگلی بات یہی کہی تھی۔ ان تین چار دنوں میں وہ بڑی ڈپریسڈ رہی تھی۔ اس کا کسی بھی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا بڑی مشکلوں سے اس نے اپنے معمول کے کام خود پر جبر کر کے انجام دیے تھے۔

"بس ذرا کچھ مصروفیت تھی اس لیے فرصت سے بیٹھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔"

وہ رواداری سے مسکراتے ہوئے بولی تو وہ گردن ہلا کر کہنے لگا۔ "میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ بڑی مشکلوں سے تو محلے میں کسی سے دوستی ہوئی تھی اور وہ خاتون بھی غائب ہو گئیں۔"

"آپ اکیلے بور ہوتے ہوں گے۔ ابھی تو آپ کی

یہاں کسی سے زیادہ دوستی وغیرہ بھی نہیں ہوگی؟"
رمیشہ نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

"ہاں یہاں محلے میں تو بس دو چار لوگوں سے آتے جاتے دعا سلام ہوئی ہے۔ ویسے میرے یہاں پر رشتہ دار وغیرہ ہیں اس کے علاوہ کچھ دوست بھی میرے یہاں کراچی میں رہتے ہیں۔ مگر روزانہ سب سے ملنا تو بڑا ہی ناممکن کام ہے۔ وہ لوگ بھی کب تک کمپنی دیں گے اس لیے میں خود ہی زیادہ کسی کو ڈسٹرب نہیں کرتا۔"

وہ جینز اور ٹی شرٹ پہنے بڑا فریش نظر آرہا تھا' چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ جو مقابل کے دل کو بھی خوشی دینے کا باعث بنے' چھائی ہوئی تھی۔ اس نے رمیشہ کو اپنی جانب اتنا بغور دیکھتا پایا تو شوخ سی ہنسی ہنس کر بولا۔

"میری ممی کہا کرتی ہیں بلیک کلر مجھے سوٹ کرتا ہے۔ لگتا ہے اب ممی کی بات کا یقین کرنا ہی پڑے گا۔"

ایک پل کے لیے تو وہ بری طرح جھینپ کر رہ گئی تھی۔ پھر اپنی جھینپ مٹانے کے لیے فوراً" بولی۔

"ماؤں کو اپنے بچے ہر رنگ میں اچھے لگتے ہیں' آپ اپنی ممی کی بات کو اتنا سیریس مت لیں۔"

اور جواب میں وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"شکر ہے آپ نے بولنا تو شروع کیا۔ ورنہ میں سوچتا تھا ہر وقت چپ رہنے سے آپ کا منہ تو نہیں دکھ جاتا۔ بولنے اور ہنسنے میں اتنی کنجوسی اچھی بات نہیں ہے اور ویسے بھی آپ کی مسکراہٹ چاہے مونالیزا جتنی حسین نہ سہی' مگر اتنی بھیانک بھی نہیں کہ آپ ہنسنا ہی چھوڑ دیں۔"

اس کے بے تکلفانہ انداز تخاطب نے رمیشہ کو کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شہریار بڑی توجہ سے اسے ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس روز وہ دونوں کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ اپنی پسند ناپسند وغیرہ ایک دوسرے کو بتاتے رہے۔ حیرت انگیز طور پر ان دونوں کی پسند ناپسند میں بڑی مماثلت تھی۔ جو جو رائٹرز شہریار کو پسند تھے وہی رمیشہ کے بھی پسندیدہ تھے۔ میوزک بھی دونوں کو ایک سا پسند تھا۔ انہیں سب چیزوں پر باتیں کرتے کرتے مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ اذان کی آواز سنتے ہی شہریار نے اس سے اجازت چاہی تھی۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔ اذان ہو گئی۔ باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ جلدی سے مسجد پہنچوں' کہیں جماعت نہ نکل جائے۔"

اور اس کی اس بات سے رمیشہ کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہ اپنی عمر کا ایک طویل عرصہ باہر گزارنے کے باوجود اپنے مذہب اور رسم و رواج سے دور نہیں ہوا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ بھی اندر آگئی تھی اور نماز کی تیاری کرنے لگی۔

نماز کے بعد وہ حسب معمول کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کرنے آگئی تھی۔ گو گھر میں ایک کل وقتی ملازم موجود تھا مگر وہ لوگ اس سے صرف اوپر کے کام کروایا کرتے تھے۔ کھانا یا تو وہ پکاتی یا پھر بھابھی اور یا پھر کی نوبت کبھی سالوں ہی میں آتی تھی۔ ہاں جس وقت وہ کھانا پکا رہی ہوتی بھابی کچن کے اندر اور باہر اتنے چکر لگاتی تھیں کہ دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ بے چاری بہت کام کر رہی ہیں۔ انہیں کوئی کام نہ کرنے کے باوجود ہر جگہ چھائے رہنے کا ہنر آتا تھا۔

اگر اس کے چڑھائے سالن میں انہوں نے غلطی سے ٹماٹر یا ادرک بھی کاٹ کر ڈال دی ہوتی اور وہ چیز اچھی پک جاتی تو وہ کھانے کی میز پر اسے اپنے ہاتھوں کی کاوش قرار دیتی تھیں۔

"خالی گوشت چڑھانے سے تو سالن نہیں پک جاتا سالن کی شکل اتنی پھیکی سیٹھی لگ رہی تھی۔ میں نے سارے مسالے اور ڈالے' آئل اور ڈالا۔ تب کہیں جا کر یہ شکل نکلی۔"

اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ اسی وقت کا کوئی نہ کوئی جملہ فوراً" بول دیا کرتی تھیں اور وہ چپ کی چپ رہ جاتی تھی۔

چار دن کے چھائے اس جمود کے بعد آج اسے

URDU PHOTO

اپنا آپ اپنا موڈ بہتر ہوتا محسوس ہوا۔ وہ سالن بھونتے ہوئے اپنا من پسند گانا گنگنا رہی تھی۔

"کیا بات ہے خالہ! آج تو موڈ بڑا اچھا ہے۔"

عاشی نے کچن میں داخل ہوتے ہی اس سے کہا تھا اور اس کے ٹوکنے پر وہ خود حیران رہ گئی تھی۔ اس کے حساب سے تو آج سارا دن میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی' جس سے موڈ اچھا ہونے کا کوئی تعلق ہو۔ اس نے آج کوئی خوشی کی خبر بھی نہیں سنی تھی۔ وہ تو اس دن شادی سے آنے کے بعد سے ہی بہت اداس اور چپ چپ تھی پھر آج اچانک ایسا کیا ہوا۔ وہ سوچتی رہی اپنے آپ سے الجھتی رہی مگر اپنی خوشی کا سبب خود بھی نہیں جان پائی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اگلے روز شام میں بچوں کو پڑھاتے وقت وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا جلدی سے بچوں سے فارغ ہو جائے۔ عاشی کو میتھس کا ٹیسٹ دیا' اریب سنی اور عبداللہ کو مضمون لکھنے کے لیے دیا اور خود جلدی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ اپنی فائل' بکس اور پین اٹھائے وہ بالکونی میں نکلی تو سامنے والی بالکونی ویران دیکھ کر اس کا دل ایک دم اداس ہو گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر سامنے ہی دیکھے جا رہی تھی۔ جب اس نے سامنے کھلی کھڑکی سے اندر کمرے کا دروازہ کھول کر آتے شہریار کو دیکھا۔ گرے سوٹ پہنے ہاتھ میں بریف کیس لیے وہ شاید ابھی ابھی آفس سے آیا تھا۔ صوفے پر بریف کیس رکھ کر وہ اب وہیں بیٹھ کر شوز اتار رہا تھا' اچانک اس کی نظر سامنے پڑی تو ایک دم اس کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ چھا گئی تھی۔ وہ فوراً" کھڑا ہوا' کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکتے ہوئے وہ باہر نکل آیا۔

"شکر ہے آج گھر آتے ہی آپ کی شکل دیکھی ہے۔ لگتا ہے' اب باقی کا دن اچھا گزرے گا۔" وہ ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے بولا۔

"یہ بات صبح صبح کسی کا منہ دیکھنے پر کہی جاتی ہے۔ جبکہ اس وقت تو شام ہو چکی ہے۔" رمیشہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے یہ محاورے اور اس قسم کی دیگر باتیں کوئی آسمان سے تھوڑی اتری ہیں کہ ان میں ترمیم نہ کی جا سکے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ "خیر آپ سنائیے کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں وہی روٹین کا کام کل کے لیکچرز تیار کر رہی تھی۔" وہ کچھ بیزاری سے بولی تو شہریار کہنے لگا۔

"لگتا ہے آپ روٹین لائف سے تنگ آگئی ہیں۔ ایسا کریں کچھ دنوں کے لیے کہیں ہل اسٹیشن پر آؤٹنگ کے لیے چلی جائیں' فریش ہو جائیں گی۔"

اس کے پرخلوص انداز پر رمیشہ مسکرا دی۔

"یہ بات سوچی تو جا سکتی ہے۔ عملاً" ایسا کرنا تقریباً" ناممکن ہی ہے۔"

"کیوں' اس میں ناممکن کیا ہے؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا میری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ مجھے ہی ان کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔" رمیشہ نے وضاحت کی تو وہ اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔

"لیکن اس طرح تو آپ ایگزاسٹ ہو جائیں گی' تھوڑی بہت تفریح تو ضرور کرنی چاہیے۔ آپ کے گھر میں اور بھی تو لوگ ہیں۔ ساری ذمہ داری آپ نے اکیلے کیوں اٹھائی ہوتی ہے۔ سب مل جل کر ذمہ داری اٹھائیں تو کسی پر بھی بوجھ نہیں پڑتا اور اس سے آپس میں محبت بھی بڑھتی ہے۔"

وہ صاف گوئی سے دوٹوک انداز میں بولا تو رمیشہ اس ٹاپک کو ختم کرنے کے خیال سے بولی۔

"چلیں میں کوشش کروں گی کہ آپ کے مشورے پر عمل کروں اور مری یا ایبٹ آباد وغیرہ تک ہو آؤں۔"

شہریار اس کا انداز محسوس کر کے ہنس دیا۔ صاف لگ رہا تھا وہ صرف بات ختم کرنے کے لیے اس طرح بولی تھی۔ کچھ دیر وہ دونوں یوں ہی باتیں کرتے رہے۔

باتیں کرتے کرتے اچانک رمیشہ ہی کو اس بات کا خیال آیا کہ وہ ابھی تھکا ہارا آفس سے آیا ہے۔ اس نے ابھی کپڑے بھی نہیں چینج کیے تو اس سے بولی۔

"آپ ابھی ابھی آفس سے آئے ہیں اور میں نے آپ کو باتوں میں لگا لیا۔ پلیز آپ فریش ہوں جا کر۔" پھر وہ خود بھی اندر آ گئی۔ رات میں سونے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ کھڑکی پر کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ آج وہ حیران نہیں ہوئی تھی پتا تھا یہ شہریار کی حرکت ہے وہ اٹھ کر باہر آئی تو وہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آج میرا نشانہ نہیں چوکا دیکھ لیں، آپ کا شیشہ بالکل سلامت ہے۔"

"شیشہ تو سلامت ہے۔ آپ یہ بتائیں مجھے بلایا کیوں ہے؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اسٹاک ایکسچینج کی تازہ ترین صورت حال معلوم کرنی تھی۔ علاوہ ازیں پاکستان میں آنے والے زلزلہ اور اس کے اثرات پر گفتگو کرنی تھی اس کے علاوہ۔" وہ بڑا جل کر بول رہا تھا جب رمیشہ کے بے ساختہ قہقہے نے اسے اپنی ادھوری بات چھوڑ دینے پر مجبور کیا تھا۔

"بولتی ایسے ہیں جیسے بڑی مصروف شخصیت ہیں اب کیا آپ سے بات کرنے کے لیے کسی باقاعدہ ایجنڈے کی ضرورت ہوا کرے گی۔ کیا بندہ یونہی گپ شپ نہیں کر سکتا۔" اس کے اس شکوے پر وہ فوراً معذرتی انداز میں بولی۔

"آئی ایم سوری۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ آئندہ یہ بات کبھی نہیں کہوں گی۔" اس کی معذرت پر وہ منہ بناتا ہوا چپ ہو گیا۔

"کہہ تو دیا سوری۔" اب کے وہ چڑ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ شہریار جواب میں کچھ کہتا رمیشہ کے کمرے کا دروازہ کھولتی سمیعہ اندر آئی تھی۔

"میں حیران ہو رہی تھی کہ آپ کمرے سے کہاں گئیں۔ واش روم کا دروازہ بھی کھلا ہے۔" وہ صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں میں اس میں تھی۔" پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگا جیسے وہ کوئی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔ جبکہ سمیعہ اس کے تاثرات سے بے خبر آرام سے بیٹھی تھی۔

"اچھا یہ ہیں ہمارے نئے پڑوسی۔" سمیعہ نے اندر کمرے میں جاتے شہریار کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ وضاحتی انداز میں بولی۔

"میری بھی آج فرسٹ ٹائم ملاقات ہوئی ہے۔ بظاہر تو اچھے لوگ لگ رہے ہیں، خیر ہمیں کیا جیسے بھی ہوں۔ ہماری تو یہ ویسے بھی بیک سائڈ ہی ہے۔" وہ اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے بولی تو سمیعہ بھی گردن ہلا کر کہنے لگی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، ویسے بھی سب سے زیادہ آپ کو ہی ان لوگوں سے فرق پڑے گا۔ ہم سب کے بیڈ رومز تو نیچے ہیں اور سنی وغیرہ کے بھی سامنے ہیں اور آپ کی کبھی کسی سے لڑائی ہو ہی نہیں سکتی اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ میری فرینڈ ہے نازر گل، پتا ہے کیا کہہ رہی تھی؟"

سمیعہ اپنی باتونی عادت کے مطابق شروع ہو چکی تھی اور رمیشہ نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اس کی باتوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ سمیعہ یونہی باتیں کرنے کے لیے آئی تھی۔ کافی دیر بعد جب وہ اٹھ کر گئی اور وہ لائٹ آف کر کے سونے لیٹی تو خود سے سخت ناراض تھی۔

"یہ سب کیا تھا۔ کیا اسے ایسی حرکتیں کرنا زیب دیتا تھا۔ اسے اور کچھ نہ سہی، اپنے مرتبے ہی کا خیال کر لینا چاہیے تھا۔ پہلی مرتبہ تھا جب اسے کسی سے جھوٹ بولنا پڑا تھا۔ اپنی کسی حرکت کی پردہ پوشی کرنا پڑی تھی اور یہ سب اسے بہت برا لگ رہا تھا۔ ایسی حرکتیں تو اس نے اس وقت بھی نہیں کی تھیں جب اس کی عمر تھی اور اب اس عمر میں وہ یہ سب اسے بہت برا لگ رہا تھا۔ اگلے مہینے وہ پورے تیس سال کی ہونے والی تھی۔ اور اس ایج میں تو بڑے سے بڑے شوخ اور لاابالی لوگ بھی سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور وہ اتنی فضول حرکتیں کر رہی تھیں۔ وہ خود سے خفا ہو گئی تھی

-وہ اپنی اسٹوڈنٹس کو کس منہ سے کوئی نصیحت کر سکتی تھی' اگر وہ خود ایسی چیپ حرکتیں کرے گی۔

اسے شہریار سے ملے پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے شام کے وقت بالکونی میں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکیاں اور پردے وہ ہر وقت بند رکھنے لگی تھی' اور جو بات اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ ایسا وہ خود پر جبر کر کے کر رہی تھی۔ وہ جو دل ہر وقت گنگنانے کو چاہنے لگا تھا۔ خود بخود جو وہ خوش رہنے لگی تھی وہ ساری کیفیات یکسر ختم ہو گئی تھیں۔ اب ہر وقت دل پر اداسی ڈیرا جمائے رہتی تھی۔ اس دوران دو تین مرتبہ رات کے وقت اسے کھڑکی پر کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز بھی سنائی دی تھی' مگر وہ منہ سر لپیٹے بستر میں دبکی رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود کو کوئی سزا دے رہی ہے۔ صبح کالج میں بھی اس پر عجیب سی کوفت سوار رہتی۔ خوامخواہ ہر کسی سے لڑنے کو دل چاہنے لگا تھا۔ اس کی کولیگز اور اسٹوڈنٹس اس کے بیزار انداز پر حیران تھیں۔ اس کی خوش مزاجی اور دھیما انداز ہر جگہ مقبول تھا۔ وہ خود سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھی۔ خود اپنے آپ کو کوئی بات سمجھانا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ بات اس نے اب جانی تھی۔ اس رات وہ خود کو بہلا رہی تھی' سمجھا رہی تھی اپنے آپ کو باور کرا رہی تھی۔

"یہ کوئی محبت وحبت نہیں ہے۔ صرف اور صرف یہ ہے کہ میں ان دنوں کسی فرینڈ کی کمی بہت زیادہ محسوس کرنے لگی ہوں۔ مجھے اکیلا پن ستاتا ہے۔ اس لیے میں اس سے باتیں کر لیتی ہوں اور اس سے باتیں کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے سر پر سوار کیا جائے۔" اس نے خود کو ڈانٹا تھا۔

اچانک وہ کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر جھانکا۔ اس کے کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ راکنگ چیئر پر جھولتا کوئی کتاب پڑھنے میں مگن تھا۔ کتنی ہی دیر تک کھڑی وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ اپنی اس بے اختیاری کیفیت کا احساس ہوا تو وہ فوراً" پردہ چھوڑ کر ہٹنے لگی۔ اسی وقت اس نے شہریار کی آواز سنی۔ وہ اپنی نظریں کتاب پر سے ہٹائے اب گردن گھما کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"رمیشہ!" وہ ایک دم پیچھے جانا نہیں چاہتی تھی' مگر کوئی طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ بڑے تھکے تھکے قدموں سے چلتی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی۔ اس کا دل عجیب متضاد کیفیات کا شکار تھا۔ وہ بیک وقت خوش بھی تھی اور اداس بھی۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی گہری سوچ کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ رمیشہ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

"کیا ہوا ہے۔ کیا میری کوئی بات بری لگی ہے۔ پلیز جو بھی بات ہے مجھے بتاؤ۔ مگر میرے ساتھ اس طرح مت کرو۔"

رمیشہ نے اسے اس سے پہلے کبھی بھی اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر دم ہنسنے ہنسانے والا انسان اس وقت بے حد الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی تو بجائے الفاظ کے آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس وقت شاید خود پر قطعاً" کوئی اختیار محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے رونے سے روکنا چاہتی تھی مگر ایسا کرنے سے قاصر تھی۔ وہ سر جھکائے اشک بہا رہی تھی اور وہ اسے روتا دیکھ کر بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔

"خدا کے لیے مجھے بتاؤ تو سہی' ہوا کیا ہے؟" وہ چیخ اٹھا تھا اور اس کے چیخنے پر وہ ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ بس آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ آپ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔ میں آپ سے کبھی بھی ملنا نہیں چاہتی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں چلائی۔

"کیوں چلا جاؤں' کیا کیا ہے میں نے۔ کیا برا کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ؟" وہ ایک دم غصے میں آ گیا۔

"آپ میری پرسکون زندگی کو ڈسٹرب کر رہے ہیں

-میں بہت سکون سے رہتی تھی۔ مجھے ویسے ہی رہنے دیں۔ آپ اس طرح کیوں ملتے ہیں جیسے میں آپ کے لیے بہت اہم ہوں۔ جیسے مجھ سے ملنا اور باتیں کرنا آپ کے لیے بہت بڑی خوشی کا باعث ہے۔ آپ کیوں کرتے ہیں ایسا؟" وہ اپنے آنسو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے ہذیانی انداز میں بولی۔

"میں اس لیے اس طرح ملتا ہوں کیونکہ تم واقعی میرے لیے بہت اہم ہو۔ ہاں تم سے ملنا اور تم سے باتیں کرنا مجھے خوشی دیتا ہے اور اگر میں ایسا کرتا ہوں تو اس سب میں برائی کیا ہے۔ میں نے اپنی عمر کے تینتیس سال اپنے کیریر اور پروفیشن کی محبت میں گزار دیے۔ شادی کے بارے میں میرا نظریہ تھا کہ جب تک مجھے کوئی اس حد تک اچھا نہ لگے کہ مجھے اپنی زندگی میں اس کی کمی محسوس ہونے لگے میں شادی نہیں کروں گا۔ ممی میری شادی کی شدید خواہش رکھنے کے باوجود کبھی مجھے اس بات کے لیے قائل نہ کر سکیں کہ میں ان کی پسند کی لڑکی سے شادی کر لوں۔ شیخ صاحب سے یہ مکان خریدنے کے سلسلے میں یہاں آیا اور تب میں نے تمہیں یہیں اسی بالکونی میں بیٹھے دیکھا تھا۔ تم خود میں مگن اپنا کام کر رہی تھیں اور اسی وقت مجھے خود میں مگن اس دلکش وجود نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تم نے کبھی سوچا کہ پورا گھر چھوڑ کر میں نے اپنے لیے فرسٹ فلور پر بنے اسی کمرے کا انتخاب کیوں کیا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ تمہارے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ تمہیں تو پتا بھی نہیں ہو گا یہاں شفٹ ہونے کے بعد کتنی مرتبہ صرف تمہیں دیکھنے کے لیے میں بالکونی میں آیا کرتا تھا۔ پھر ایک روز تمہارے پیپرز اڑ کر یہاں آ گئے اور مجھے تم سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ جیسے جیسے تم سے ملتا گیا تمہاری کئی اور خوبیاں مجھے پتا چلتی چلی گئیں اور میں نے جانا کہ میرا انتخاب بالکل درست تھا۔ میں تم سے یہ سب کہنا چاہتا تھا' مگر تمہیں ایک دم پتا نہیں کیا ہو گیا۔ میں نے تمہیں بلانے کی کتنی کوشش کی' مگر تم نے ہر بار مجھے مایوس کیا

-کیوں رمیشہ! تم اس طرح کیوں کر رہی ہو کیا کسی کو پسند کرنا اتنا بڑا گناہ ہے۔ کیا میں نے کوئی برا کام کیا ہے؟ اس روز جب تم بالکونی میں بیٹھی میرا انتظار کرتی میرے کمرے میں دیکھ رہی تھیں تو میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ مجھے اس بات کا اطمینان ہو گیا تھا کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے نرم گوشہ موجود ہے -پھر اب ایسا کیا ہوا ہے جو تمہیں پریشان کر رہا ہے؟"

اس نے بڑے جوشیلے انداز میں اپنی بات شروع کی تھی' مگر آخر میں ایک مرتبہ پھر اس کا لہجہ وہی دوستانہ سا ہو گیا تھا۔ وہ منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوری امید تھی کہ ابھی وہ جواب میں کچھ نہ کچھ کہے گی۔

"رمیشہ! میری بات کا جواب دو۔" وہ انتظار سے تنگ آ کر بولا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ ٹین ایجرز والی حرکتیں کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔" وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے بولی۔

"کیا کسی سے شادی کرنا ٹین ایجرز والی حرکت ہے -میں تمہارے ساتھ کوئی افیئر نہیں چلا رہا۔ میں نے ممی کو تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔ کل ہی ممی اور طلحہ پاکستان آئے ہیں۔ ممی تو فوراً" تمہارے گھر آنے کے لیے تیار تھیں۔ میں نے انہیں روکا۔ میں تم سے اس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ تم سے تمہارے اس گریز کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ پلیز رمیشہ! اس طرح مجھے اگنور مت کرو۔ ایسا کر کے تم صرف مجھے ہی نہیں خود کو بھی دکھ پہنچا رہی ہو۔ تمہارے آنسو اس بات کی سب سے بڑی گواہی ہیں۔ مت خود سے جھوٹ بولو۔"

وہ بڑی آس سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رمیشہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

"میں ممی کو تمہارے گھر بھیج دوں؟" وہ اس کی آنکھوں کو اپنی نظروں گرفت میں لیتے ہوئے بولا اور وہ خود سے کیے تمام عہد بھلائے گردن ہلا گئی تھی اور دوسری طرف وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا تھا۔

"تھینک گاڈ؟ میں نے یہ معرکہ تو سر کیا۔ اس سے آسان تو ایورسٹ سر کرنا ہو گا۔ لڑکی! تم اتنی مشکل کیوں ہو؟"

اور وہ ایک پل سے زیادہ اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکی تھی۔ ان مقناطیسی نگاہوں سے اس وقت وہ سخت کنفیوز ہو رہی تھی۔ پیچھے سے وہ اسے آوازیں دیتا رہ گیا مگر وہ مڑ کر دیکھے بغیر واپس کمرے میں آ گئی۔ دل ابھی تک تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سب اتنا اچانک کیسے ہو گیا۔ وہ اتنی آسانی سے کیسے ہار مان گئی اور وہ شہریار احمد یقیناً" دلوں کو فتح کرنے کے تمام گر جانتا تھا۔ اس نے اسے جیت لیا تھا دیکھ لینا وہ کوئی بہت ہی منفرد سا بندہ ہو گا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اسپیشلی تمہارے لیے بنایا ہو گا۔ جب وہ آئے گا تو تم یہ انکار و نکار سب بھول جاؤ گی۔ وہ یونانی دیوتاؤں کی سی آن بان والا آئے گا اور آ کر تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

کلثوم کے برسوں پہلے کہے گئے جملوں کی بازگشت آج بھی اس کی کانوں میں گونج رہی تھی۔ کتنے دنوں بعد وہ پر سکون ہو کر سونے لیٹی تھی۔ آج اسے خواب دیکھتے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ بند آنکھوں کے پیچھے نظر آتے شہریار احمد کے تصور سے وہ پیچھا چھڑانے کی شعوری کوشش نہیں کر رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

صبح وہ بال سلجھاتی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ شہریار کو دیکھ کر وہ ایک دم ہٹنے لگی تو وہ فوراً" بولا۔

"مجھ سے بات نہیں کرنی تو مت کرو۔ مجھے صرف یہ پیغام دینا تھا کہ آج شام ممی تمہارے گھر آئیں گی۔" اس کے ہٹنے سے پہلے وہ خود واپس کمرے میں چلا گیا تھا۔

اس روز شام کا انتظار کرنا اسے بڑا ہی کٹھن لگا۔ ایسا لگ رہا جیسے وقت رک گیا ہو۔ کالج سے آنے کے بعد ہی سے وہ سخت کانشس تھی۔ دو تین بار اس نے کوشش کی کہ یہ بات امی کو بتا دے، مگر ہر بار ایک جھجک سی آڑے آ گئی۔ وہ نہ جانے اس کے بارے میں کیا سوچیں گی یہی سوچ کر وہ ہچکچا کر رہ گئی۔ شام میں گیٹ پر بیل کی آواز سن کر وہ ایک دم نروس ہو گئی۔

سنی نے گیٹ پر دیکھا تھا، مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ لاؤنج میں آ گیا۔ رمیشہ اور امی وہیں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

"دادی کوئی آنٹی آئی ہیں انہیں آپ سے ملنا ہے۔" سنی کا پیغام سن کر امی اٹھیں اور آہستہ قدموں سے چلتی ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔ سنی جیسے ہی ادھر ادھر ہوا وہ جلدی سے اٹھ کر ڈرائنگ روم کے برابر والے کمرے میں آ گئی۔ اور کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر باتیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ اپنی اس حرکت پر اسے خود ہی ہنسی آ رہی تھی۔ ایسی حرکتیں فلموں وغیرہ میں دیکھ کر وہ کتنا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ امی اور شہریار کی ممی کے درمیان رسمی سے باتیں ہو رہی تھیں۔

اس گفتگو کے دوران عاشی کولڈ ڈرنک وغیرہ سرو کر کے جا چکی تھی۔ تھوڑی بہت دیر کی پر تکلف گفتگو کے بعد جب وہ اپنے مطلب کی بات پر آئیں تو رمیشہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ پتا نہیں وہ کیا بتائیں گی اور امی کیا سمجھیں گی۔ اسے فکر لاحق ہوئی۔ مگر جب انہوں نے امی سے کہا۔

"آپ کی بیٹی رمیشہ ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔ آتے جاتے کئی بار اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ بہت سلجھی ہوئی اور اچھے اخلاق و اطوار کی مالک ہے۔"

تو اس کا دل احساس تشکر سے لبریز ہو گیا۔ وہ ساری زندگی باہر گزار کر آئی تھیں۔ ان کے نزدیک پسند کی شادی کوئی بری چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ انہیں ایسا کہنے کے لیے یقیناً" شہریار نے کہا ہو گا، رمیشہ کو پورا یقین تھا اور وہ شخص اسے اور بھی زیادہ اچھا لگنے لگا تھا۔

"آپ کی عزت افزائی کا بہت شکریہ۔ آپ نے میری بیٹی کو اپنے بیٹے کے لیے پسند کیا آپ سے مل کر اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ کا بیٹا یقیناً" بہت اچھا ہو گا۔ مجھے آپ کو انکار کرتے افسوس تو ہو رہا ہے، مگر مجبوری

یہ ہے کہ ہم لوگ خاندان سے باہر رشتہ نہیں کرتے۔"

امی کی دل چیر دینے والی یہ باتیں سن کر وہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی خوشی اس سے کتنی آسانی سے چھین لی گئی تھی۔ اس کے بعد امی کی اور ان کی کیا کیا باتیں ہوئیں اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھ گئی تھی۔

"ایسا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا اس کا خیال تھا وہ رشتہ لے کر آئیں گی امی ہاں یا ناں کہے بغیر انہیں رخصت کر دیں گی اور بعد میں وہ امی سے اس رشتے کے لیے اقرار کرنے کا کہے گی۔ مگر کچھ بھی اس کی سوچ جیسا نہیں ہوا تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا تھا۔

"ہمارے پیچھے والے مکان میں جو لوگ رہتے ہیں ان کی والدہ آئی تھیں۔ اپنے بیٹے کے لیے رمیشہ کا رشتہ مانگنے۔"

کھانے کی میز پر امی نے یہ بات بھیا کے گوش گزار کی، بھابھی ایک دم سب مصروفیت چھوڑ چھاڑ امی کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ وہ صرف سب کے سوالوں سے بچنے کے لیے کھانے کی میز پر بیٹھی تھی۔

"آپ نے کیا جواب دیا؟" بھابی نے بھیا کو موقع دیے بغیر جلدی سے پوچھا۔

"جواب کیا دینا تھا۔ میں نے بہانا کر دیا کہ ہمارے ہاں اپنوں میں شادی کرتے ہیں۔ ارے ایسے کیسے کسی انجان آدمی کے حوالے کر دوں میں اپنی بیٹی، وہ بتا رہی تھیں ان کا بیٹا امریکن نیشنل ہے۔ ارے یہ امریکہ پلٹ بڑے خطرناک ہوتے ہیں پہلے ہی وہاں شادی کر رکھی ہوتی ہے۔ پاکستان آ کر دوبارہ دولہا بن جاتے ہیں۔"

امی نے فخریہ انداز میں داد طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا، بھیا تو خاموشی سے کھانا کھاتے رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا انہیں اس ذکر سے زیادہ پائے کھانے میں مزہ آ رہا تھا۔

بھابی نے البتہ فوراً" ہی امی کی ہاں سے ہاں ملائی تھی۔ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ"

اور وہ جس کے بارے میں یہ ساری بات ہو رہی تھی خاموش بیٹھی اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماؤں کو تو اپنی بیٹیوں کی شادی کی بہت فکر ہوتی ہے پھر اس کی امی ایسی کیوں ہیں، انہیں کیوں اس کے دل کی خوشی کا خیال نہیں۔ مائیں تو بچوں کے چہرے پڑھ لیا کرتی ہیں۔ اور امی نے کیا اس کا چہرہ نہیں پڑھا۔ اس نے اپنے پروپوزلز آتے اور ریجیکٹ ہوتے بہت دیکھے تھے مگر یہ پہلا موقع تھا کہ کسی آنے والے کو اسی وقت انکار کر دیا گیا تھا۔ ورنہ امی عام طور پر اگلی ملاقات میں انکار کیا کرتی تھیں۔ اس بار انہیں انکار کرنے کی اتنی جلدی کیوں تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ مسلسل اسی قسم کی باتیں سوچ رہی تھی۔

"خوشیوں کی عمر اتنی مختصر کیوں ہوتی ہے۔ ابھی تو میں نے ڈھنگ سے خواب دیکھے بھی نہیں تھے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔" تمام تر صبر و ضبط کے بند ٹوٹ چکے تھے۔ وہ اپنے خوابوں کی اس پامالی پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ "اور وہ شہریار میرے بارے میں کیا سوچے گا۔ کہ میں جھوٹی ہوں میں نے اس سے کی کمٹمنٹ نہیں نبھائی۔"

وہ خود کو کسی صورت سمجھا نہیں پا رہی تھی۔ اس کے اندر کوئی چیخ چیخ کر اعلان بغاوت کر رہا تھا، اپنی خوشی پانے کی طلب کر رہا تھا۔ ساری رات روتے روتے گزر گئی تھی۔ صبح اس کا کالج جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، مگر پھر بھی اسے امی کے کام کرنے کے لیے تو لازمی باہر نکلنا ہی تھا امی کے لیے ناشتا لے کر پہنچی تو وہ اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ رہنے دیتیں ناشتا، کوئی اور بنا دیتا۔ تم آرام کرتیں۔"

اور امی کے اس تشویش بھرے انداز پر اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ کبھی کسی اور موقع پر انہوں نے یہ

URDU POINT

بات کی ہوتی تو وہ خوشی سے نہال ہو جاتی' مگر آج اسے اس بات سے کوئی خوشی نہ ہوئی تھی۔

ناشتے کی تیاری میں بھابھی کی مدد کرانے کے خیال سے کچن میں گئی تو انہوں نے بڑی معنی خیز نگاہوں سے اس کے روئے روئے چہرے کو دیکھا۔ ان کی نگاہوں کی معنی خیزی اسے کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔ صرف بھابھی کے سوال جواب سے بچنے کے لیے وہ کالج کے لیے تیار ہو گئی۔ جب دل اداس ہو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا' یہی حال اس کا تھا۔ کالج جا کر اس کے دل کی اداسی اور ویرانی ہنوز برقرار تھی۔ چھٹی کے وقت پارکنگ کی طرف آتے وہ بے حد الجھی ہوئی تھی۔ اپنے گھر جانے کا تصور اسے زندگی میں پہلی مرتبہ سوہان روح لگا تھا۔ گاڑی کا لاک کھولتے سامنے سے آتے شہریار کو دیکھ کر بے ساختہ اس کے ہاتھ سے کی چابی گر گئی تھی۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے' میرا خیال ہے اس بات کے لیے کالج مناسب جگہ نہیں ہے۔"

وہ دو ٹوک انداز میں حکم دیتا واپس گیٹ کی طرف چلا گیا تھا اس نے مڑ کر یہ دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ وہ اس کے پیچھے آ بھی رہی ہے یا نہیں۔ اور وہ چپ چاپ مجرموں کی طرح اس کے پیچھے چلنا شروع ہو گئی تھی۔ گیٹ سے باہر نکلی تو وہ گاڑی میں اس کا منتظر بیٹھا تھا رمیشہ جیسے ہی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ دو چار منٹ کی خاموشی کے بعد شہریار نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے بیٹھی اپنے ہاتھوں کو گھور رہی تھی۔

"تم روئی تھیں؟" اس کی طرف بغور دیکھتا وہ بولا تھا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیئے یونہی بیٹھی رہی تو وہ چڑ کر بولا۔

"ہر مسئلے کا حل رونا نہیں ہوتا' میں نے تمہیں ممی کے آنے کا بتایا تھا پھر تم نے اپنی امی کو پہلے سے اس بارے میں کچھ کیوں نہیں بتایا۔" اس کی مسلسل چپ سے تنگ آ کر وہ مزید غصے میں آ گیا۔

"اور تمہارے گھر والے کس قسم کے ہیں۔ تمہاری امی نے تم سے پوچھے بغیر فوراً" ہی منع کر دیا۔ پتا ہے ممی گھر آ کر مجھے کیا بتا رہی تھیں' وہ کہہ رہی تھیں کہ رمیشہ کی امی کا سرے سے اس کی شادی کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ اتنے خود غرض لوگوں کی تم دن رات ایک کر کے خدمتیں کرتی ہو؟" شہریار کی یہ بات اسے تیر کی طرح جا کر لگی تھی۔

"پلیز شہریار! آپ اس قسم کی باتیں مت کریں۔" اس کی ناگواری کا وہاں کوئی اثر نہ تھا۔ وہ بڑے تحمل انداز میں بولا۔

"جو سچ بات ہے میں وہی کہوں گا۔ تمہارے گھر والوں کے نزدیک تم صرف ایک مشین ہو اور بس۔ اور سب سے افسوس کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں تمہاری امی بھی شامل ہیں۔ تمہیں سن کر حیرت ہو گی کہ میں نے ممی کو بھیج تو دیا تھا مگر تمہارے گھر والوں کے بارے میں' میں نے اتنے دنوں میں جو رائے قائم کی تھی' اس حساب سے یہی جواب متوقع تھا۔ وہ کیوں تمہاری شادی کریں' ایسی اچھی نوکرانی' باورچن' نرس' گورنس' ڈرائیور' ٹیچر انہیں کہیں اور ملے گی بھی تو نہیں۔"

"آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میرے گھر والوں کو کچھ کہیں۔" وہ بھی اب کے غصے میں آ گئی تھی۔

"ہاں مجھے کوئی بھی حق نہیں ہے۔ وہ جو تمہاری زندگی تباہ کر رہے ہیں۔ انہیں سب حقوق حاصل ہیں۔ رمیشہ! تم لاکھ حقیقت سے آنکھیں چراؤ مگر سچ یہی ہے کہ تمہارے گھر میں کوئی بھی تم سے محبت نہیں کرتا۔ وہ سب تم سے اپنا مطلب پورا کرتے ہیں تم نے کبھی مجھ سے اس بارے میں زیادہ بات نہیں کی مگر پھر بھی مجھے پتا ہے' تم خود بھی ان تمام باتوں کو محسوس کرتی ہو۔ کیا کوئی ماں اتنی ظالم ہو سکتی ہے کہ محض اس وجہ سے اپنی بیٹی کی شادی نہ کرے کہ اس کی

شادی ہو گئی تو میری خدمت کون کرے گا' کیا کوئی بہن ایسی ہو سکتی ہے کہ اس لیے اپنی بہن کی شادی نہ ہونے دے کہ اس کی شادی ہو گئی تو میرے بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اور کیا کوئی بھائی بھائی ایسے ہو سکتے ہیں کہ اس لیے اپنی بہن کی شادی نہ کریں کہ اگر اس کی شادی ہو گئی تو بیمار اور معذور ماں کی ساری ذمہ داری ہم پر آ جائے گی۔"

وہ بڑی بے رحمی سے وہ تمام باتیں کر رہا تھا جو اس نے اس سے پہلے صرف محسوس کی تھیں' کبھی ان کا کسی سے اظہار نہیں کیا تھا۔

"رمیشہ! یہ زندگی ہمیں صرف ایک بار ملی ہے۔ تمہاری زندگی پر دوسروں سے زیادہ تمہارا حق ہے۔ تم اپنی زندگی خود جیو۔ ایسا کیوں ہے کہ تمہاری زندگی دوسرے لوگ بسر کر رہے ہیں۔ ان مطلب پرستوں کے چنگل سے نکل آؤ۔"

شہریار کی نرم لہجے میں کی گئی یہ بات اسے بری طرح غصہ دلا گئی تھی۔

"جو امید آپ مجھ سے رکھ رہے ہیں افسوس میں وہ کبھی بھی پوری نہیں کر سکتی۔ میرے لیے دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر میری ماں اور بہن بھائی ہیں۔ آپ مجھے کسی غلط بات کے لیے مت اکسائیں۔"

"اس کا مطلب ہے تم اپنے گھر والوں کے سامنے اسٹینڈ نہیں لو گی۔"

وہ ایک دم بریک لگا کر بولا تھا' گاڑی سڑک کے کنارے روک کر وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"جی ہاں جو میری امی کا فیصلہ ہے' وہی میرا بھی ہے۔ میں اپنے گھر والوں کے خلاف نہیں جا سکتی۔"

اس کی بات سنتے ہی اس نے طوفانی انداز میں گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے شہریار نے اس کے کالج کے سامنے گاڑی روکی تھی وہ سامنے ونڈ اسکرین پہ نظریں جمائے خاموش بیٹھا تھا وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

"پلیز آپ مجھے مس انڈر اسٹینڈ مت کیجئے گا۔

آپ...؟" شہریار کے تند و تیز لہجے نے اسے اپنی بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

"رمیشہ تیمور! مجھے ظلم کرنے والے سے زیادہ نفرت ظلم سہنے والے سے ہے۔ اور آج سے تم بھی ان ہی قابل نفرت لوگوں میں شامل ہو گئی ہو۔ میں تمہیں کوئی بددعا نہیں دے رہا۔ مگر آج سے دس پندرہ سال بعد جب تم بالکل اکیلی رہ جاؤ گی' سب ایک ایک کر کے تمہیں اپنا مطلب پورا ہونے پر چھوڑ جائیں گے' تب چاہے ایک لمحے کے لیے سہی مگر میں تمہیں یاد ضرور آؤں گا۔ مگر تب سوائے پچھتاووں کے زندگی میں کچھ بھی نہیں بچا ہو گا۔"

گاڑی آگے جا چکی تھی۔ اور وہ ابھی تک وہیں کھڑی چپ چاپ اس جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ایسا لگتا تھا زندگی ٹھہر گئی ہے۔ یوں جیسے کرنے کو کچھ رہا ہی نہیں ہے۔ وہی تمام معمولات زندگی جنہیں پہلے وہ بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا کرتی تھی اب اسے صرف ایک ذمہ داری محسوس ہوتے تھے۔ اسے ایسا لگنے لگا تھا جیسے وہ واقعی ایک مشین بنتی جا رہی ہے۔ شہریار نے شاید اپنا کمرہ ہی بدل لیا تھا اس کے کمرے کی اب ہر وقت لائٹ بند رہتی تھی۔ اس شخص کا دل توڑ کر خوش تو وہ بھی نہیں تھی۔

"کیا اب ساری زندگی یونہی گزرے گی۔ کیا یہ احساس زیاں مجھے ہمیشہ یونہی تنگ کرتا رہے گا۔ کیا اب زندگی میں میں' کبھی سچے دل سے ہنس پاؤں گی۔ کیا اسے کھو کر مجھ سے جی لیا جائے گا۔"

اپنے اندر سے اٹھتے ان سوالوں کو وہ دانستہ نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اپیا پاکستان آئی ہوئی تھیں۔ ان کی آمد پورے گھر کو ہلا دیا کرتی۔ امی کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ سب کو ہر وقت اپیا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہنے پر مجبور

URDU PHOTO

کر دیتیں۔

اس کی طبیعت کافی دنوں سے خراب تھی۔ پہلے دو دن تو اس نے اس بخار کا زیادہ نوٹس نہیں لیا اور خود ہی دوا وغیرہ کھا کر دوبارہ کام میں لگ گئی۔ اپیا کے آنے کی وجہ سے کام کا بوجھ بھی بڑھ گیا تھا۔ گھر میں کھانا پکانے کے لیے نوکر چاکر تو تھے نہیں۔ اور امی بیٹی اور داماد کے لیے ہر وقت دعوتی اہتمام چاہتی تھیں۔ خود اپیا کا بھی ایک سے ایک مشکل ڈش کھانے کا دل چاہتا رہتا تھا۔

"بارش ہو رہی ہے' آلو کے پراٹھے بنالو۔" اور اگر آلو کے پراٹھے صرف کہہ دینے سے فوراً" بن جایا کرتے تو بات ہی کیا تھی۔

اتوار تھا' سارے ہی افراد گھر پر موجود تھے۔ بھابی تو ایسے موقعوں پر بڑی خوبصورتی سے ہری جھنڈی دکھا دیا کرتی تھیں۔ صرف الوا بلنے کے لیے انہوں نے رکھے تھے اس کے بعد اچانک ان کے سر میں شدید قسم کا درد شروع ہو گیا تھا۔ نتیجتاً وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب کھانا لگ رہا تھا ان کا درد اچانک خود بخود ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔

"چلو اب تم بیٹھو' کب سے لگی ہوئی ہو' کھانا میں لگالوں گی۔"

انہیں کسی سے بھی تعلقات نہ بگاڑنے کا گر آتا تھا۔ سمعیہ اور عاشی تو تھیں ہی کام چور اس لیے آرام سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔

طبیعت خراب میں اتنی دیر تک کھڑے رہ کر کام کرنے سے اس کی طبیعت مزید بگڑ گئی تھی۔ پورا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا' وہ کھانا کھائے بغیر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ ہاتھ لگا کر خود کو دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اسے کتنا تیز بخار ہو رہا تھا۔ وہ کھانا لگا کر ایسے ہی کمرے میں آ کر لیٹ گئی تھی۔ اس لیے اب توقع کر رہی تھی کہ کوئی نہ کوئی اسے بلانے ضرور آئے گا۔ اس کے اندر اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر کمبل اوڑھ لیتی۔ وہ انتظار کر رہی تھی کہ کوئی آئے اور وہ کمبل خود پر ڈلوا کر کوئی دوا بھی اپنے لیے منگوا لے۔ کافی دیر گزر گئی تھی اور کوئی بھی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔

وہ اکیلی پڑی کراہ رہی تھی۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔

"کیا ہوا پھپھو! آپ کھانے پر کیوں نہیں آئیں" عبداللہ کی آواز سن کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

"عبداللہ! مجھے یہ کمبل اڑھا دو' اور ڈسپرین یا کوئی بھی پین کلر مجھے لا دو۔" اس کی نقاہت بھری آواز سن کر وہ ایک دم چونکا۔

"پھپھو! آپ کو تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ چلیں ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" عبداللہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے ہی فوراً" کہا۔

پھر عبداللہ نے اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ کھڑی ہوئی' اس سے ایک قدم بھی نہیں اٹھ رہا تھا۔ پتا نہیں اتنی دیر وہ کیسے کچن میں کھڑی رہی تھی۔ شاید اس میں عام لوگوں سے زیادہ ول پاور تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی حالت کے پیش نظر اور مریضوں سے پہلے اسے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر نے ٹائیفائڈ کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔

وہ چیک اپ کروا کر دوائیں لے کر گھر واپس آ گئی تھی۔ لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ جاتے وقت بخار بہت تیز تھا۔ اس لیے وہ اس طرف دھیان نہ دے سکی تھی۔

"سب لوگ کہاں ہیں؟" عموماً" گھر والے لاؤنج ہی میں بیٹھا کرتے تھے۔ خصوصاً" اتوار کو تو سب لاؤنج ہی میں پائے جاتے تھے۔

"موسم اچھا ہو رہا تھا اس لیے بڑی پھپھو سب کو گھمانے لے گئیں۔ صرف میں' مما' پپا اور آپ گھر پر ہیں۔" عبداللہ کی بات پر اسے شاک لگا تھا۔

"دادی بھی گئی ہیں؟" اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے تصدیق چاہی تھی۔

"ہاں' ویسے وہ جا نہیں رہی تھیں' بڑی پھپھو انہیں زبردستی لے کر گئی ہیں۔ میں اس لیے نہیں گیا کیونکہ آج ہمارا میچ ہے۔ میں تو آپ کو دیکھنے آیا تھا کہ

آپ کر کیا رہی ہیں۔ آپ نے کسی کو بتایا بھی نہیں کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔ کھانے کی میز پر آپ کی غیر حاضری کی وجہ سے مما کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا' وہ کہہ رہی تھیں "ہاں ہم بھوکوں کے لیے وہ پکا کر اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں۔ ایک دن اکیلے کام کر لیا تو اتنا برا لگا ہے۔ ہمیشہ ہم مل کر ہی کام کرتے ہیں۔ کیا بندے کی کبھی طبیعت خراب نہیں ہو سکتی۔ اب وہ غصے میں کھانا ہی نہیں کھائیں گی۔ پھر مما ناراض ہو کر ٹیبل پر سے اٹھ گئی تھیں۔ اسی لیے وہ بڑی پھپھو کے ساتھ بھی نہیں گئیں اور پاپا بے چارے اب مما کو منانے میں مصروف ہیں۔"

عبداللہ خود ہی اپنی بات کو انجوائے کرتا ہوا ہنسا تھا۔ جب کہ وہ چپ چاپ بت بنی اس کی بات سن رہی تھی۔ عبداللہ نے اسے دوائی کھلائی اور خدا حافظ کہتا باہر چلا گیا۔

"اچھا پھپھو! میں میچ کھیلنے جا رہا ہوں' دیر سے آؤں گا۔"

دوا کھا کر کب اس کی آنکھ لگی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ آن کیا اور گھڑی کی طرف دیکھا تو پتا چلا رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔

دوائی کی وجہ سے بخار فی الحال تو اتر گیا تھا۔ وہ ہمت کر کے بستر پر سے اٹھی۔ دوا کی اگلی خوراک سے پہلے کچھ نہ کچھ کھانا بے حد ضروری تھا' وہ نیچے آئی تو امی' اپیا اور عاشی لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ امی اس کی طرف دیکھتے ہی فوراً" بولیں۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں رمیشہ! کوئی گھر آئے مہمانوں کے ساتھ اس طرح بھی کرتا ہے۔ کبھی' کبھی تو بہن بہنوئی آتے ہیں اور ان کے لیے اگر تم کچھ پکا لو گی تو کیا اس طرح روٹھا کرو گی۔"

"بھئی میں نے تو ایک بات کہی تھی۔ اگر تمہارا دل نہیں چاہ رہا تھا تو منع کر دیتیں۔ اس طرح سب کا موڈ تو خراب مت کرواتیں۔ بلاوجہ بھابھی بھی سب سے ناراض ہو گئیں۔ بس امی اب جب تک میں یہاں ہوں خود کھانا پکاؤں گی۔ تاکہ جھگڑے کی جڑ ہی ختم ہو۔ کام پر اتنی کل کل' کھانا پکانا بھی کوئی کام ہے۔ میں چالیس چالیس لوگوں کی دعوتیں وہاں اکیلے ارینج کرتی ہوں۔"

اپیا نے بغیر کسی مروت کے حسب عادت اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ پتا نہیں کیوں دل ایک دم اتنا بھر آیا کہ وہ بجائے کوئی جواب دینے کے واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں آ کر بلک بلک کر روتے وہ مزید نڈھال ہو گئی تھی۔ عبداللہ بہت لاپروا تھا کھیل سے آ کر اسے کسی کو اس کی بیماری کی بابت بتانا یاد ہی نہیں رہا ہو گا مگر کیا اس کی شکل سے نہیں پتا چل رہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔

"تمہارے گھر والوں کے نزدیک تم صرف ایک مشین ہو۔" یہ بات یاد آنے کی دیر تھی اس کے رونے میں اور شدت آ گئی تھی۔

"ہاں میں مشین ہوں' اور مشین صرف کام کرتی اچھی لگتی ہے۔ جب تک مشینری صحیح طرح کام کرتی ہے ہم استعمال کرتے ہیں اور جب وہ کام درست طریقے سے نہ کریں تو انہیں یا تو مرمت کرایا جاتا ہے یا پھر کہیں اسٹور وغیرہ میں فالتو سامان کی طرح ڈال دیا جاتا ہے۔"

مسلسل ذہنی دباؤ' رات بھر رونا اور پھر دوا بھی نہ کھانے سے صبح اس کی طبیعت مزید خراب ہو گئی تھی۔ گھر میں اس کے بغیر صبح ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ امی کو جب وقت پر ناشتہ نہیں ملا تو اسے دیکھنے آئی تھیں۔ پھر انہوں نے ہی اسے دودھ پلایا اور دوا کھلائی۔

"خود پر ترس کھانے کا یہ کون سا انداز ہے۔ طبیعت خراب تھی تو بتانا چاہیے تھا۔ کسی کو الہام تو ہونے سے رہا۔"

وہ اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولیں تو وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ پھر اس پر اتنی مہربانی ضرور ہو گئی تھی

URDU PHOTO

کہ دوپہر میں سمیعہ اس کے لیے کھانا کمرے میں لے آئی تھی۔

"سمیعہ! میرے پاس تھوڑی دیر اور بیٹھ جاؤ۔ اکیلے میرا دل گھبرا رہا ہے۔" وہ کھانا رکھ کر جانے لگی تو رمیشہ نے کہا تھا۔

"سوری پھپھو! میں بیٹھ جاتی مگر مجھے اپنی فرینڈ کے گھر جانا ہے۔ آکر آپ کے پاس بیٹھوں گی۔" اور وہ اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

وہ گھر والوں کی صحت سے متعلق بہت کانشس رہا کرتی تھی کوئی بھی بیمار ہوتا تو وہ خدمت میں دن رات ایک کر دیتی تھی۔ اور آج اس کے پاس دو گھڑی بیٹھنے کی کسی کے پاس فرصت نہیں تھی۔ ابا اور امی ایک ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟" ابا نے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ان کے لہجے میں کسی قسم کی شرمندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ مختصر جواب دے کر چپ ہو گئی

"صرف ٹھیک نہیں، جلدی سے بالکل پہلے کی طرح ہو جاؤ۔ سنی کی برتھ ڈے کرنے کا سوچ رہے ہیں ہم لوگ، سارا انتظام تمہیں ہی کرنا ہے۔" وہ اس کے ہاتھ تھام کر پیار سے بولیں تو اسے اس پیار میں غرض کی بو آئی۔

"میں اور جواد شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں یہ بتاؤ، تمہارے لیے کیا لاؤں" وہ مزید بولیں۔

"تھینک یو، ابا میرے پاس سب کچھ تو ہے۔" اس کا جواب سن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بس اب جلدی سے یہ بستر چھوڑو تم لیٹی ہوئی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہیں۔" وہ اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولیں۔

"امی آپ بھی چلیں۔" ابا نے امی سے کہا۔

"بھئی مجھ سے بازاروں میں مارے مارے نہیں پھرا جاتا تم لوگ جاؤ۔"

امی کے جواب پر وہ فوراً بولیں "زیادہ نہیں پھرنا مجھے تو صرف جیولر کے پاس جانا ہے۔ سعودی گولڈ تو بہت جمع ہو گیا یہاں سے ایک آدھ چین لینے کا سوچ رہی ہوں۔ چلیں نا آپ؟" اور امی ناچار کھڑی ہو گئیں۔

"رمیشہ! اگر طبیعت بہتر محسوس ہونے لگے تو سنی کو ذرا دیکھ لینا۔ ایک تو تمہارے علاوہ اب یہ بچے کسی اور سے پڑھنے پر راضی بھی نہیں ہوتے۔ اس کے امتحان بالکل سر پر آ گئے ہیں۔" ابا اور امی کمرے سے جا چکی تھیں۔ رات کا کھانا بھی کمرے ہی میں آ گیا تھا۔ کھانے کے بعد بھابھی اس کے لیے دودھ لے کر آئی تھیں۔ وہ ہی مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے کا انداز۔

"جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، تمہارے بغیر گھر اتنا سونا سونا لگ رہا ہے۔ مجھے تو بالکل مزہ نہیں آ رہا۔"

بھائی نے مسکرا کر کہا تھا سونے سے پہلے بھیا بھی اسے دیکھنے آئے تھے۔

"میں نے تمہاری بھابی سے کہا ہے تمہیں زیادہ سے زیادہ جوس پلائیں۔ دیکھو کتنی کمزور ہو رہی ہو۔ اب کل سے پابندی کے ساتھ دو ٹائم ایپل جوس لینا ہے۔ بھابھی جوس لائیں تو منع مت کرنا۔"

وہ اسے پیار کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے

"تو سب لوگ مل کر مشین کی مرمت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں" اس نے طنزیہ انداز میں سوچا۔ ابھی وہ اتنی ناکارہ نہیں ہوئی کہ کباڑ میں ڈال دی جائے۔ ابھی وہ بہت سے لوگوں کے کام آ سکتی تھی۔ اس لیے اس مشین کو درست حالت میں لانے کے جتن سب کر رہے تھے۔ مگر کل جب یہ مشین مرمت ہونے کے قابل نہیں رہے گی تو اس کی حیثیت بھی گھر میں پڑے کسی فالتو سامان سے زیادہ نہیں ہوگی۔ وہ جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی الجھ رہی تھی۔

"یا اللہ! مجھے درست فیصلہ کرنے کی ہمت عطا فرما۔" اس نے صدق دل سے اپنے رب کو پکارا۔

"آج سے دس پندرہ سال بعد جب تم بالکل اکیلی

رہ جاؤ گی سب ایک ایک کر کے تمہیں اپنا مطلب پورا ہونے پر چھوڑ جائیں گے تب چاہے ایک لمحے ہی کے لیے ہی سہی مگر میں تمہیں یاد ضرور آؤں گا مگر تب سوائے پچھتاوؤں کے زندگی میں کچھ بھی نہیں بچا ہوگا۔"

شہریار کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"کیا میری زندگی واقعی ایک پچھتاوا بن کر گزرے گی۔" وہ خود سے پوچھ رہی تھی۔ خوشیاں اور محبتیں اس کے در پر دستک دے رہی تھیں اور وہ انہیں نظر انداز کر رہی تھی۔

محبتیں اور خوشیاں سب کے دروازے پر دستک دیتی ہیں جو عقل مند ہوتے ہیں فوراً آگے بڑھ کر انہیں خوش آمدید کہتے ہیں اور کچھ بے وقوف ساری عمر تقدیر کو روتے رہتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ کبھی خوشی نے ان کا در بھی کھٹکھٹایا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ محبتیں مایوس لوٹ جائیں اسے یہ در وا کر دینا چاہیے۔ اس نے خود سے کہا "ابھی دیر نہیں ہوئی۔ ابھی میں اس روٹھے ہوئے کو منا لوں گی۔ میں بیٹھ کر اس آنے والے وقت کا انتظار نہیں کروں گی۔ جب زندگی میرے لیے پچھتاوا بن جائے۔ میں در دل پر دستک دیتی ان خوشیوں کو خوش آمدید کہہ رہی ہوں۔ پتا نہیں میں صحیح ہوں یا غلط مگر میرا دل مطمئن ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے پہلی مرتبہ کوئی فیصلہ اپنے دل کی خوشی کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔"

وہ خود سے کہتی بستر پر سے اٹھ گئی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ اب مزید ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنا چاہتی تھی اسے محبتوں کے کھو جانے کا خوف تھا، اس کی انگلیاں بڑی تیزی سے ٹیلی فون پر ایک نمبر ملا رہی تھیں۔

"ہیلو.....!" شہریار کی نیند سے بوجھل آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"شہریار! میں اپنی زندگی خود جینا چاہتی ہوں۔"

"رمیشہ تم!" وہ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی آواز سن کر حیران ہوا تھا، اس کی بات کا مطلب سمجھا تو خوشی سے چیخ کر بولا۔

"کیا کہہ رہی ہو، دوبارہ سے کہو، مجھے یقین نہیں آ رہا۔" اس کی خوشی سے کھنکتی آواز سن کر رمیشہ کے لب بھی مسکرا دیے تھے۔

"میں زندگی میں کبھی پچھتانا نہیں چاہتی۔" اس نے آہستگی سے کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔ وہ خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

فون کی بیل بجنا شروع ہوئی تو وہ سمجھ گئی کہ شہریار کا ہے۔ اس نے پہلی ہی بیل پر فون اٹھا لیا تھا۔ وہ خوشی سے پاگل ہوتا اس سے فیصلے کی تبدیلی کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ اور وہ جواب میں اس سے اپنے دل کی ہر بات کہہ رہی تھی۔ اس نے خوشیوں کو روٹھنے نہیں دیا تھا۔

خوشیوں بھرے نئے موسم اس کے آنگن میں اتر آئے تھے۔

★

URDU PHOTO